قاضی جی

شوکت تھانوی

قاضی جی

(ڈرامے)

شوکت تھانوی

ربانی کتاب گھر
C-20۔ جیوتی کالونی، لونی روڈ، شاہدرہ، دہلی۔ 110032

نام کتاب : قاضی جی
مصنف : شوکت تھانوی
سن اشاعت : ۲۰۰۹ء
قیمت : =/210 روپے
مطبوعہ : فائن آفسیٹ پریس، شاہدرہ، دہلی۔ 32
ناشر : راہی کتاب گھر، C-20۔ جیوتی کالونی،
لونی روڈ، شاہدرہ، دہلی۔ 110032

ISBN-81-88645-45-1

Qazi Jee
By.: Shaukat Thanvi
Price : Rs.210/=
Edition : 2009
RAHI KITAB GHAR
C-20, Jyoti Colony, Loni Road,
Shahdara, DELHI-110032
Mobile : 9818786196

Sole Distributors:-
KITAB WALA
2794, Gali Jhot Wali,
Pahari Bhojla, DELHI-110006
Ph.: (O)23281499, 9810277298

انتساب

اُس قاضی کے نام
جس نے ہمیں
نابالغ
سے
بالغ بنادیا

شوکت تھانوی

اس ناول میں شائع ہونے والے تمام نام، واقعات، کردار، اور مقامات قطعی فرضی ہیں۔ کسی زندہ یا مردہ شخص سے مطابقت محض اتفاقیہ امر ہوگی، جس کے لیے مصنف یا ناشر پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔

دیباچہ

قاضی صاحب قبلہ مدظلہ العالی کی تخلیق کا سہرا شوکت بھیا کے سر ہے۔ لیکن ان حضرت کی پیدائش سے بلاواسطہ تھوڑا سا تعلق میرا بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ گزشتہ سال یعنی ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے فوراً بعد مغربی پنجاب میں عام معاشرتی واخلاقی حالات بہت المناک صورت اختیار کر چکے تھے۔ مسلمانوں پر اچانک مصائب پے بہ پے یوں نازل ہو رہی تھیں کہ وہ حواس باختہ سے ہو گئے تھے۔ دہشت کے مختلف حربے استعمال میں لاکر انھیں بڑی بے دردی سے مشرقی پنجاب سے نکالا جارہا تھا۔ کوئی دن نہ جاتا تھا کہ ان کے قافلوں پر سفاکانہ حملے نہ کیے جاتے ہوں۔ اور ٹرینیں اور ٹرک ان کے زخمیوں کو لے کر نہ پہنچتے ہوں۔ خانہ ویرانوں کی خستہ حال جماعتیں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں بھوک سے بلکتی اور پیاس سے تڑپتی ہوئی روزانہ وارد ہو رہی تھیں۔ حکومت اور مغربی پنجاب کے باشندوں سے جو کچھ بن پڑتا تھا کر رہے تھے، لیکن مصیبت ایسی اچانک اور مسئلہ اتنا عظیم تھا کہ سراسیمگی نے ہاتھ پاؤں پھلا ڈالے تھے۔ خود اعتمادی ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اخلاق کا معیار گرتا چلا جارہا تھا۔ افواہوں کا دور دورہ تھا۔ حوصلے گر رہے تھے ہمتیں پست ہوتی جارہی تھیں۔

اس زمانہ کے ان حالات سے متاثر ہو کر میں نے ریڈیو پاکستان کے سامنے

خاص قسم کے ایک ایسے پروگرام کی مفصل تجویز پیش کی جس کا تعلق ملت کے قومی واخلاقی استحکام سے تھا۔ یہ تجویز پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی۔ اور فیصلہ ہوا کہ ریڈیو پاکستان لاہور۔ سے اس تجویز کے مطابق ''پاکستان ہمارا ہے'' کے نام سے یہ پروگرام کو ہر روز شام کو $\frac{1}{2}$۸ سے ساڑھے ۸ تک نشر کیا جایا کرے۔ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں مجھے سب سے بڑا تردد یہ تھا کہ کہیں یہ خشک اور بے مزہ وعظ کی صورت اختیار نہ کرے۔ چنانچہ میں چاہتا تھا کہ ضرورت کے مطابق چیزوں کو اختصار کے ساتھ اور متنوع انداز اور اثر وتاثیر سے پیش کیا جائے۔ کہ لوگ پروگرام سے اکتانے نہ پائیں۔ بلکہ اول سے آخر تک بہت دلچسپی سے سنیں۔

منجملہ دوسری چیزوں کے میں اسی پروگرام میں ایک دلچسپ اور مستقل کردار ایسا چاہتا تھا، جو پروگرام کی اغراض کو پورا کرنے کے ساتھ اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے تفریح بخش بھی ہو۔ اسی سلسلہ میں کئی روز تک طرح طرح کی تجاویز سوچی اور مسترد کی جاتی رہیں۔ شوکت بھیا پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں میرے شریک کار تھے۔ اچانک ان کے ذہن کے افق پر چوچ قسم کے ایک بزرگوار کا چہرہ نمودار ہوا۔ اورشوکت صاحب نے حسب معمول آنکھوں میں شوخی کی چمک لے کر اور گردن کو اپنے مخصوص لوچدار انداز میں لچکا لچکا کر بیان کی رنگینیوں سے ان کا خاکہ کھینچنا شروع کیا تو ان حضرت میں طرح طرح کے امکانات منکشف ہونے شروع ہوئے۔ ایک برخود غلط قسم کے بزرگ، لکیر کے فقیر، پاکستان سے اس لیے نالاں کہ اس نے آپ کو بعض ادنیٰ آسائشوں سے محروم کر دیا ہے۔ لیکن ان تمام جائز و ناجائز مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے کمربستہ جو پاکستان کے معرض، وجود میں آنے سے پیدا ہو گئے ہیں۔ غرض پرستی اور اتنی آسانی کے گئے گزرے عہد کی یادگار۔ ان تمام صفات سے کورے جو قومی و اخلاقی استحکام کی جان سمجھی جاسکتی ہیں۔ دخل درمعقولات میں انتخاب، کج بحثی میں لاجواب غرض چھوٹی بڑی کمزوریوں کی ایک طرفہ معجون۔ بحیثیت مجموعی ایک ایسی شخصیت جس کے کھوکھلے پن کو بازار کا ایک عام شخص بھی پورے طور سے محسوس کر کے اپنی پوری برتری کی لذت سے بہرہ اندوز ہو سکے۔ ان بزرگوار کو ''قاضی صاحب'' کے نام سے یاد کرنے میں غالباً ''شہر کے اندیشے'' نے شوکت صاحب کی رہنمائی کی ہو گی۔

اس کردار کو پوری تفصیل سے سوچنے کے بعد شوکت صاحب نے خود مائیکرو فون پر جوشیلی متانت کے ایسے کمال سے پیش کیا کہ دو یا تین ہی پروگراموں کے بعد قاضی صاحب مدظلہ العالی کا نام بچے بچے کی زبان پر تھا۔ ''پاکستان ہمارا ہے'' کے سلسلہ میں جو خط آتا یا جہاں کہیں بات چیت ہوتی، قاضی صاحب کا تذکرہ اس میں آنا ضروری ہوتا۔ سننے والے کسی غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے قاضی صاحب کا کوئی پروگرام نہ سن سکتے تو محرومی کا صدمہ محسوس کرتے۔

ایسے حالات میں مجھے یقین ہے کہ قاضی صاحب کے یہ پروگرام کتابی صورت میں شائع ہونے کے بعد بہت دلچسپی اور ذوق وشوق سے پڑھے جائیں گے۔ اتنی بات ضروری ہے کہ یہ پروگرام مائیکروفون کے لیے لکھے جاتے تھے اور قاضی صاحب کا کردار ایک مخصوص انداز میں ادا کرنے کا تصور مصنف کے ذہن میں برابر موجود رہتا تھا۔ وہ اس کا ایک ایک فقرہ ایک خاص انداز سے دل ہی دل میں ادا کر کے سپرد قلم کرتے تھے۔ لہٰذا یہ کرداری خاکے سرد الفاظ کے سپرد ہونے کے بعد اس رعنائی کا بہت سا افسوں کھو بیٹھیں گے جو شوکت صاحب کی اداکاری کا کمال ان میں پیدا کر دیتا تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے یقین واثق ہے کہ پاکستانی دور کے اس پہلے مزاحیہ کردار میں تفریح کا اتنا بہت سامان موجود ہے کہ یہ کتاب غیر معمولی مقبولیت حاصل کرے گی۔ چونکہ یہ کرداری خاکے اسی زمانے کی پیداوار ہیں جب میں اور

شوکت بھیا صبح سے رات تک کا وقت ایک جنوں انگیز مصروفیت میں گزارتے تھے۔ اس لیے ان کا کتابی صورت میں آجانا اکٹھے گزارے ہوئے دنوں کا ایک مستقل اور یادگارِ عام صورت اختیار کر لینا ہے، لہٰذا میرے لیے دلی مسرت کا موجب ہے میری دعا ہے کہ ان مضامین کو طباعت کی دنیا میں بھی ایسی ہی بے نظیر مقبولیت حاصل ہو جیسی یہ سماعت کی دنیا میں حاصل کر چکے ہیں۔

خاکسار
امتیاز علی تاج
۱۳ر مئی ۱۹۴۸ء

(۱)

کمال اور اجمل مہاجرین کے لیے جمع کیے ہوئے کپڑوں کا شمار کر رہے ہیں۔

اجمل : ”لکھو کمال، شلواریں چالیس عدد، قمیصیں بائیس، کوٹ سولہ اور یہ کیا ہے؟“

کمال : ”دیکھو اجمل یہ کرو اس طرح سب کپڑے گڑبڑ ہو جائیں گے اور مہاجرین کو تقسیم کرنے کے وقت دقت ہو گی۔ میری رائے میں بچوں کے الگ لکھواؤ۔ زنانہ الگ اور مردانہ الگ“۔

اجمل : ”لاحول ولا قوۃ۔ لیجیے قاضی جی تشریف لا رہے ہیں دماغ چاٹنے۔ اب ہو چکا کام۔“

کمال : ”اونہہ آنے بھی دو۔ وہ اپنے منہ سے بکیں گے۔ کوئی ہمارا ہاتھ تھوڑی پکڑ لیں گے۔“...... ”اخاہ تشریف لایئے قاضی جی“۔

قاضی جی : (آتے ہوئے) ”اے سبحان اللہ۔ جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔ کیا کوئی واشنگ کمپنی وغیرہ کھولنے کا ارادہ ہے یا مالِ غنیمت کا بٹوارہ ہو رہا ہے۔ اچھا اچھا اب سمجھا! یہ گویا حسبِ معمول وہی قومی خدمت ہو رہی ہو گی۔ ارے میاں کیوں پاگل بنے ہو۔ یہ جو دن بھر اور آدھی رات تک خاک چھانتے پھرتے ہو۔ اس سے آدمی

لیڈر نہیں بنا کرتا۔‘‘

کمال : ’’جس وقت لیڈر بننے کا ارادہ ہوگا آپ سے مشورہ کر لیں گے۔ فی الحال تو یہ ایک معمولی سی خدمت ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’اچھی خدمت ہے کہ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا۔ وہی تباہی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ نہ دو گھڑی بیٹھنے کا کوئی وقت ہے نہ کسی وقت پتہ چلتا ہے کہ آپ حضرات آخر گئے کہاں ہیں۔ کل رات کو دس بجے تک لڑکے کو دوڑایا کہ بھئی اگر آ گئے ہوں تو بلا لاؤ۔ کس شوق سے تمہاری بھابی نے مرغ پکایا تھا۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی اس قومی خدمت کی بدولت میرا کھانا بھی غارت ہوا۔ ساڑھے دس بجے مرغ تو نہیں البتہ مرغ کی آئس کریم کھانا پڑی۔ اب اس وقت بھی آپ لوگ اچھے خاصے دھوبی بنے ہوئے ہیں۔ آخر یہ کیا لغویت؟‘‘

کمال : ’’مہاجرین کے لیے یہ کپڑا اکٹھا کیے ہیں۔ مگر یہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آئے گی۔ ہاں بھائی اجمل تو دو پٹے گویا کل چودہ ہیں۔‘‘

قاضی جی : ’’خدا نہ کرے یہ حماقت میری سمجھ میں آئے۔ یہاں اپنی ہی مصیبتیں کیا کم ہیں کہ یہ بیگار لے کر بیٹھ جائیں۔ پورا ایک ہفتہ ہو چکا ہے آپ کے کھانڈ والے وعدے کو۔ کیوں جناب اجمل صاحب یاد ہے۔‘‘

اجمل : ’’معاف کیجیے گا قاضی جی بالکل وقت نہ مل سکا۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیجئے کہ آپ کی کھانڈ سے زیادہ ضروری کام یہ ہے یا نہیں۔‘‘

قاضی جی : ’’کیا خوب یعنی آپ کو معلوم بھی ہے کہ آپ کے اس پاکستان کے بدولت پورا ایک ہفتہ ہو چکا ہے چاء پیے ہوئے۔ نہ کھانڈ ملے گی نہ چائے پی سکیں گے وہ شکر والی کیچڑ تو قیامت تک مجھ سے پی نہ جائیگی۔‘‘

کمال : ’’قاضی جی بغیر چائے پیے آج تک کوئی موت واقع نہیں ہوئی۔ لیکن اگر یہ کپڑے وقت پر مہاجرین کو نہ ملے تو خدا جانے کتنے غریب سردی کھا کر بے موت مر جائیں گے۔ مہاجرین کا حق بہر حال مقدم ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’وہ کیسے؟ یعنی آپ کو معلوم ہے کہ سو مہاجروں کا ایک مہاجر میں بیٹھا ہوا ہوں۔ زندگی میں دو ہی تین شوق کیے چائے، پان اور لباس۔ ان تینوں کا جو حال ہو رہا ہے وہ آپ کو خوب معلوم ہے کھانڈ عنقا ہے لٰہذا چائے غائب۔ پان کا یہ عالم ہے کہ آٹھ آٹھ اور دس دس آنے ایک ایک پتا اسی لاہور میں بک گیا۔ اب پان ملنے لگے ہیں تو چھالیا ندارد شہر بھر کی دکانیں چھان ماریں منجن بنانے کی سڑی ہوئی چھالیا سونے کے بھاؤ بک رہی ہے۔ ارے صاحب یہی تو وہ لاہور ہے جہاں مہرے لے کر لکھنؤ اور بنارس تک کے پان مل جایا کرتے تھے۔ جہازی۔ مانک چندی۔ کاٹھیاواڑی اور سیلونی جیسی چاہے چھالیا لے لو۔ مگر اب تو بس اللہ کا نام نظر آتا ہے۔ الائچیاں لینے جایئے تو الائچیوں کی لاشیں بٹور لایئے۔ مشکل سے دو چار الائچیاں کام کی نکل آئیں گی باقی سب ایک سے ایک مردہ کہ دیکھتے ہی پاکستان زندہ باد کہنے کو دل چاہے۔‘‘

کمال : ’’واقعی ثابت کر دیا آپ نے اپنا مہاجر ہونا۔

قاضی جی : ‘‘خیر آپ تو غالباً طنزاً فرما رہے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ زندگی تلخ ہو کر رہ گئی ہے اور کوفت ہوتی ہے یہ دیکھ دیکھ کر صاحب اسی ابتری پر اترایا جاتا ہے۔ دیوالہ پٹا ہوا ہے مگر پاکستان زندہ باد۔ مرے جاتے ہیں مگر پاکستان زندہ باد۔ پاجامہ کے لیے لٹھا نہیں ملتا پاکستان زندہ باد۔ چاء کے لیے کھانڈ نہیں پاکستان زندہ باد۔’’

کمال : ‘‘کیا واقعی آپ پاکستان کو کھانڈ سے بھی ارزاں سمجھتے ہیں۔’’

قاضی جی : ‘‘بندہ نواز پاکستان ہم نے اس لیے نہیں مانگا تھا کہ جو آرام تھا وہ بھی نہ رہے۔ ہم پاکستان کے معنی یہ سمجھتے تھے کہ ہماری آسائشوں میں خدا جانے کتنا اضافہ ہو جائے گا مگر ہوا یہ کہ ساری کو دوڑے تو آدھی بھی گئی۔’’

اجمل : ‘‘پاکستان آپ نے مانگا تھا آپ کو مل گیا اب اس کی تکالیف کو آسائشوں سے بدلنا بھی تو آپ ہی کا کام ہے۔’’

قاضی جی : ‘‘ماشاء اللہ۔ لیجیے ایک نہ شد دو شد کیوں صاحب یہ ہمارا کام کیوں ہے۔ یہ گویا ان کا کام نہیں ہے جو آنریبل کہلاتے ہیں۔ منسٹر کہلاتے ہیں۔ اور وزارتیں سنبھالے بیٹھے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کیا کام کر رہے ہیں وہ لوگ۔ آخر کیوں ہم لوگوں کو کھانڈ کی تکلیف ہے۔ چھالیا کیوں نہیں ملتی۔’’

کمال : ‘‘اجمل یہ چھالیا کا پورٹ فولیو کس وزیر کے پاس ہے۔’’

اجمل : ‘‘اس کا تعلق تو مرکزی حکومت سے ہونا چاہیے۔’’

قاضی جی : ‘‘اجی بس رہنے بھی دیجیے مجھ کو بنانے کے لیے مگر ذرا غور کیجیے تو یہ ذمہ داریاں اُسی حکومت کی ہیں جس کے آپ سینہ سپر بنے ہوئے ہیں اور جس کا کام اپنے سر آپ نے منڈھ رکھا ہے ارے بھئی یہ ہجرت ہماری ذمہ داری پر تو شروع ہوئی نہیں ہے کہ ہم مہاجرین کے لیے کپڑے بٹورتے پھریں۔ غلہ جمع کریں۔ چندے اکٹھا کریں۔ آج ہم تو خود مہاجرین کی اس ریل پیل سے مصیبت میں آ گئے ہیں۔ کہیں آنا جانا چاہیں تو سواریاں ہم کو نہیں مل سکتیں۔ وہ سب مہاجرین کو ڈھونے میں مصروف ہیں۔ سفر کرنا چاہیں تو ریل کے اوپر نیچے دائیں بائیں ہر طرف چیونٹیوں کی طرح مہاجرین کلبلا رہے ہیں۔ مکان کی ضرورت ہو تو ایک سے ایک اعلیٰ درجہ کے مکان میں آپ کو ایک سے ایک لاجواب مہاجر نظر آ جائے گا۔ آخر یہ سب میرا یا آپ کا کام ہے کہ اس ابتری کو دور کریں؟’’

کمال : ‘‘یہ کام ہم سب کا ہے جس طرح پاکستان ہم سب کا ہے۔’’

قاضی جی : ‘‘بس یہی سمجھتے رہیے اور انتقال فرماتے رہیے اور ابھی دیکھئے گا کہ آگے آگے اور کیا ہوتا ہے۔ سمیٹے جائیے مہاجرین کو۔’’

اجمل : ‘‘واقعی اگر آپ کا رنگ سب پر غالب آ گیا تو خدا ہی حافظ ہے۔’’

قاضی جی : ‘‘میرا رنگ؟ میرے رنگ سے کیا مطلب؟ حضور والا میں تو یہ جانتا ہوں کہ تین بھائیوں کی شادیاں کر چکا ہوں اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو ہر شادی میں ہزار ہزار ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار مہمانوں کا انتظام اس اکیلی جان نے اس طرح کیا تھا کہ آج تک انتظامی امور میں میرے نام کا کلمہ پڑھا جاتا ہے۔ تمام قصبواڑے میں کیا مجال جو ذرا بھی لبڑ دھون دھون ہونے دی ہو۔ وقت پر سب کو کھانا ملا۔ نہ کسی کو کسی قسم کی کوئی شکایت ہوئی نہ تکلیف پہونچی۔ تو بات کیا تھی وہ اپنا کام تھا۔ اگر

ہمارے وزیر صاحبان بھی اس کام کو اپنا کام سمجھتے تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔ “

اجمل : قاضی جی یہی تو آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ یہ کام وزیر صاحبان سے زیادہ ہمارا اور آپ کا ہے پاکستان پر ہم کو بھی وہی حق ہے جو قائداعظم کو ہو سکتا ہے۔ یہ عہدے تو ان کاموں کے لیے ہیں جو ہم نہیں کر سکتے۔ مگر جو کام ہم کر سکتے ہیں وہ بھی اگر وزیر صاحبان پر ڈال دیں تو ان کے بڑے بڑے کام رہ جائیں گے۔ آپ کو چھالیا کی فکر ہے اور ان کو مملکت کے لیے کوئلہ کی تدابیر پر غور کرنا ہے۔ آپ کو پان کی شکایت ہے اور وہ آپ کی اس سے بھی گھٹیا شکایات کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ مگر مہاجرین کا مسئلہ کسی اور طرف ان کو متوجہ ہونے ہی نہیں دیتا۔ مگر اس کے باوجود آپ خود دیکھ لیجیے کہ جو حالت کل تھی وہ آج نہیں ہے۔ اتنے کم وقت میں اتنی اصلاح کیا کم ہے اگر یہ مہاجرین کا مسئلہ طے ہو جائے تو اصلاح کی رفتار آج ہی کچھ سے کچھ ہو جائے۔ “

قاضی جی : ” اجی تو پھر مہاجرین کو چھوڑیں نا۔ “

کمال : ” کس پر چھوڑیں، آپ پر؟ “

قاضی جی : ” کس پر چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے وہ خود اپنے لیے راستہ نکال لیں گے۔ اگر آپ لوگ ان کی یہ خاطر مدارات چھوڑ دیں۔ اگر یہ پلاؤ کی دیگیں اور مفت کے کپڑے ان کے لیے آپ فراہم نہ کریں تو وہ خود ہاتھ پیر ہلائیں گے۔ “

اجمل : ” حد کر دی آپ نے۔ کس دردناک حالت میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر اور خدا جانے کیا کیا سختیاں جھیل کر، پاکستان کے لیے نہ جانے کیا کیا قربانیاں دیکر آتے ہیں وہ لوگ جن کے ساتھ آپ یہ سرد مہری کرنا چاہتے ہیں۔ “

کمال : ” واقعی قاضی جی اگر آپ ایسے ہی منتظم ہیں جیسا کہ آپ نے فرمایا تو آپ کو بھی کچھ نہ کچھ جوہر تو ضرور دکھانا چاہئیں۔ “

قاضی جی : ” اے صاحب، کرے تو آدمی جب کہ خود اس کو اپنی طرف سے اطمینان ہو۔ یہاں تو گھر بیٹھے مہاجر بن کر رہ گئے ہیں۔ قسم۔ لے لو جو ایک ہفتہ سے چاء کا ایک قطرہ بھی حلق کے نیچے اترا ہو۔ اس کے علاوہ میں تو اس لیے اور بھی کسی کام میں دخل نہیں دیتا کہ جان جلے گی بد انتظامیاں دیکھ دیکھ کر۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر بدانتظامی برداشت نہیں کر سکتا۔

اجمل : اسی لیے تو ہم لوگ کہہ رہے ہیں کہ اس بدانتظامی کو دور کرنے ہی کے خیال ہی سے سہی آپ کچھ مشورے دیا کیجیے۔ “

قاضی جی : ” مشورے غلط۔ بندہ تو اس کا قایل ہے کہ یا تو کام نہ کرو اور اگر کسی کام میں ہاتھ لگاؤ تو ایسا کہ پھر کوئی نام نہ رکھ سکے۔ “

کمال : ” ہاں ہاں تو آپ عملاً حصہ لیجیے نا۔ مثلاً اب بتائیے کہ ان کپڑوں کے سلسلہ میں کیا صورت اختیار کی جائے۔ “

قاضی جی : اوں ہنہہ۔ یہ ناتجربہ کارانہ باتیں مجھ سے نہیں ہو سکتیں۔ میں تو پہلے یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ گڑبڑ اصل میں ہے کہاں۔ وہ تم لوگ کہاں جاتے ہو روز؟ “

اجمل : ” والٹن کیمپ۔ “

قاضی جی : ” ہاں وہیں۔ میں یہ کر سکتا ہوں کہ وہاں جا کر ذرا دیکھوں تو سہی کہ

آخر یہ تماشا کیا ہے۔ سمجھ میں تو آتا نہیں کہ یہ ذرا سا مہاجروں کا قصہ اتنا طول کھینچے۔ سوائے اس کے کہ بدانتظامی ہے ضرور کہیں نہ کہیں۔‘‘

کمال : ’’بس تو اب کی آپ کا ساتھ چلنا طے رہا۔‘‘

قاضی جی : ’’تم کہہ رہے ہو تو طے ہی سمجھو۔ انشاء اللہ دیکھ لینا کہ چٹکی بجاتے کیسا نقشہ بدلتا ہوں۔‘‘

(۲)

قاضی جی : ’’توبہ توبہ توبہ...... کیا احسان فرمایا ہے آپ لوگوں نے یہاں لا کر۔ اگر پہلے سے یہی بتا دیا ہوتا کہ اس قدر گرد و غبار میں تیرنا ہے اور اس طرح زندہ درگور ہونا ہے تو کم سے کم سیاہ شیروانی ہی نہ پہنتا۔ ذرا ملاحظہ کیجیے ان مسماۃ شیروانی کا حلیہ۔ غارت ہو کر رہ گئی کمبخت۔‘‘

کمال : ’’یہاں آپ اپنا حلیہ دیکھنے آئے ہیں یا مہاجرین کا۔‘‘

اجمل : ’’قاضی جی اپنی شیروانی سے پہلے ذرا مہاجرین کے کپڑوں پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔‘‘

قاضی جی : ’’ارے بھئی وہ تو دیکھ ہی رہا ہوں مگر تمہیں میری قسم ذرا میری حالت تو دیکھو معلوم ہوتا ہے جیسے پھپھوند لگ گئی ہو۔ اور اب یہاں برش بھی نہ مل سکے گا۔

کمال : ’’شاید کسی مہاجر کے ڈریسنگ روم میں برش نکل آئے۔ جو بات فرماتے ہیں لاجواب فرماتے ہیں۔ آئے ہیں یہاں مصیبت کے ماروں کی مصیبت دیکھنے اور فکر ہے اپنے بناؤ سنگھار کی۔‘‘

قاضی جی : ’’یعنی عجیب چیز ہیں آپ۔ سنگھار کون مسخرا کر رہا ہے۔ مگر آدمی کم سے کم انسان تو نظر آئے۔ مہاجر بھی کہیں گے کہ یہ کس جانور کو پکڑ لائے۔ بہرحال تو یہ ہے گویا آپ کے مہاجرین کا وہ شہر جس کو آپ

کیمپ کہا کرتے تھے مارے دُلار کے۔ یعنی جہاں تک نگاہ جاتی ہے انسان ہی انسان نظر آتے ہیں۔ الامان والحفیظ۔ یہ آخر اتنے مہاجر آ کہاں سے گئے۔ کہیں تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں اتنے بڑے میدان میں۔"

اجمل : "حضور والا یہ پاکستان کے صرف ایک شہر اور اس شہر کے صرف ایک رفیوجیس کیمپ کا منظر ہے، جس پر آپ اس قدر حیران ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آج اس کیمپ کی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔"

قاضی جی : "اور گویا آپ بڑے فخر سے فرما رہے ہیں ڈیڑھ لاکھ۔ کیا کارنامہ بیان فرمایا ہے آپ نے۔ یہ بات تو آپ کو اُس وقت سوچنا تھی جب پاکستان بنا رہے تھے آپ لوگ۔ چھوٹا گھر بڑا سمدھیانہ۔ سوال تو یہ ہے کہ اب آخر ہوگا کیا اور رکھیں گے کہاں آپ اِس خلقت کو۔"

کمال : "رکھیں گے کہاں؟ جہاں ہم رہتے ہیں وہیں یہ بھی رہیں گے۔ پاکستان ان کا بھی اُسی طرح گھر ہے جس طرح ہمارا ہے۔ ہم مہاجرین کی زیادتی سے تو پریشان نہیں اُن کی تکالیف سے پریشان ہیں۔"

قاضی جی : "ہوں گے آپ اُن کی تکالیف سے پریشان۔ یہاں تو اسی خیال سے گویا دم نکل کر رہ گیا ہے کہ یہ ہمارے حلق کے اتنے دربان گویا اور آئے۔ یونہی ایک ایک چیز کو ترس رہے ہیں اور اب تو یہ ہوگا کہ جو کچھ مل رہا ہے اس کے گویا اتنے ساجھے دار اور آ گئے۔ یہ سب ہمارا حصہ بھی بٹا لیں گے۔ مرے بے موت بلکہ مر تو رہے ہی تھے یہ گویا مرے پہ سو درّے والی بات ہوئی۔ ماشاءاللہ۔ واہ رے آپ کے پاکستان۔"

اجمل : "کس قدر خود غرضی کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ قاضی جی۔ معلوم ہوتا ہے گویا آپ کے سینہ میں انسان کا دل ہی نہیں ہے۔ ذرا دیکھئے تو سہی کہ اِن غریبوں پر یہ مصیبت صرف اس لیے نازل ہوئی ہے کہ یہ مسلمان ہیں۔"

قاضی جی : "اے سبحان اللہ۔ کیا تقریر فرمائی ہے جناب نے۔ حضور والا یہ سب اسٹیج پر کہنے والی اوپری باتیں ہیں۔ میں تو سلام کروں گا اُس وقت جب ان ہی مہاجرین کی کثرت سے خود آپ کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ مگر آپ کو کیا معلوم ہوگا نہ جورو نہ جاتہ، اللہ میاں سے ناتہ۔ اکیلا آپ کا دم ہے۔ زندگی ہوٹلوں میں کٹتی ہے۔ مرنے کے لیے اسپتال تشریف لے جائیں گے۔ مرے تو ہم لوگ جو بیوی بچوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ نون، تیل، لکڑی کی فکریوں ہی جینے نہ دیتی تھی۔ اوپر سے آپ لوگ یہ جھگڑا لے بیٹھے۔"

کمال : "قاضی جی کچھ تو خدا سے بھی ڈرا کیجیے۔"

قاضی جی : "اے جناب۔ خدا سے تو خیر ڈرتا ہی تھا اب تو خدا کی اس مخلوق سے ڈر رہا ہوں کہ یہ آخر ہوں گے کیا، اور یہ سب سمائیں گے کہاں؟"

جمل : "معاف کیجیے گا قاضی جی، ایسی باتیں آپ کے ایسے بزرگ کے منہ سے اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ آپ کو بجائے اس کے کہ کچھ ان کی فکر ہوتی، کہ یہ اس سردی میں کھلے آسمان کے نیچے اور ٹھنڈی زمین پر کس طرح رہیں گے، میں بغیر گرم کپڑوں کے اُن کا کیا حال ہوگا۔ آپ کو تو خود اپنی فکر پڑ گئی۔"

قاضی جی : "پھر وہی۔ یہ فکر کریں نہ کریں آپ کریں۔ میرا کیا قصور ہے جو میں یہ سزا بھگتوں۔ میں نے کب آپ سے درخواست کی تھی کہ مجھ کو پاکستان دلوا دیجیے۔ بیٹھے بٹھائے یہ آپ ہی لوگوں کو سوجھی تھی کہ پاکستان لے کر رہیں گے۔ اب پاکستان تو خیر آپ نے لے لیا ہے مگر اپنے ساتھ ہم لوگوں کو بھی اس عذاب میں مبتلا کر دیا۔"

کمال : "یا مقلب القلوب، یعنی آپ رحمت کو عذاب کہہ رہے ہیں۔"

قاضی جی : "اے قربان اس رحمت پر۔ کیا خوب رحمت ہے اور اگر یہی رحمت ہے تو جناب ہی کو مبارک رہے۔ حضور والا اگر مہاجرین کی ریل پیل کا یہی عالم ہے تو وہ وقت آ رہا ہے کہ پانی کو مم کہیں گے آپ ہی لوگ، جو آج بڑے قوم پرست، بڑے مجاہد اور بڑے تیس مار خاں بنے پھرتے ہیں۔ یہ خاکسار تو اس رحمت سے باز آیا بخشیں بی بلّی چوہا لنڈورا ہی بھلا۔"

اجمل : "مگر آپ تو اس لیے یہاں تشریف لائے تھے کہ کچھ اصلاحی تدابیر اختیار کریں گے۔"

قاضی جی : "اصلاح؟ اجی توبہ کیجیے۔ اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔ اب تو اپنی ہی خیریت مزاج درگاہِ رب العزت سے نیک مطلوب ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اونٹ کس کل بیٹھے گا۔ ذرا غور کیجیے کہ اتنے آدمیوں کو دیکھ کر آدمی گنتی بھول جائے اور آپ چلے ہیں ان کی خدمت کرنے۔ وہی تو میں حیران تھا کہ آخر لاہور میں روز بروز گرانی کیوں بڑھ رہی ہے۔ جس چیز کے دام پوچھیے جواہرات کا مول ہوتا ہے اور ہونا ہی چاہیے، اتنے ساجھے دار جو پیدا ہو گئے ہیں۔"

کمال : "آپ کو تو نہیں مگر آپ کی ان باتوں سے خود ہم کو شرم آ رہی ہے قاضی جی۔ کاش آپ یہ سمجھتے کہ سب وہ ہیں جن کی قربانیوں کا صلہ ہے پاکستان۔ یہ سب کچھ چھوڑ کر، لٹ لٹا کر، مر کھپ کر آئے ہیں، مگر آئے ہیں اس جگہ جہاں آزادی کی سانس لے سکیں۔ جس سرزمین کو اپنا کہہ سکیں۔ اور اب ہمارا فرض یہی ہے کہ ان دشتِ غربت سے آئے ہوئے اپنوں کو اپنائیں اور ان کو ان کے وطن میں بسائیں۔ لیکن اگر اسی خودغرضی اور نفسا نفسی سے ہر ایک نے کام لیا جس کا نمونہ آپ پیش کر رہے ہیں تو خدا ہی حافظ ہے۔"

قاضی جی : "صاحب تو آپ صاف صاف یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ ہماری زندگی بھی عذاب بنانے کا ارادہ ہے۔ اور ارادہ کیا ہے اب تو زندگی عذاب بن کر رہے گی ہی۔ آئی ہوئی ٹل تھوڑی جائے گی۔ آخر یہ سب جائیں گے کہاں، ہم ہی سب پر نازل ہو کر رہیں گے۔ مگر واہ رے انصاف! کرے کوئی بھرے کوئی۔"

اجمل : "قاضی جی دراصل آپ یہ منظر دیکھ کر اس لیے اور بھی گھبرا گئے ہیں کہ آپ کو ان مہاجرین سے زیادہ خود اپنی فکر ہے۔ اور فکر صحیح بھی ہے، اس لیے کہ یہ لوگ گو اپنے حصہ کی قربانیاں ادا کر چکے اب آپ کے لیے یہ وقت آیا ہے کہ آپ بھی اتنی نہ سہی تھوڑی بہت قربانی تو پیش کریں۔"

قاضی جی : "جی؟ کیا فرمایا جناب نے۔ آپ بجائے مجھ سے قربانی طلب کرنے کے مجھ ہی کو ذبح کر ڈالیے۔ یعنی دیکھ رہے ہیں کہ بغیر قربانی دیے انتقال ہوا جا رہا ہے۔ ہر آرام اپنے اوپر حرام ہو چکا ہے۔ زندگی،

زندگی ہی نہیں رہی ہے نہ دل کو اطمینان حاصل ہے نہ جسم کو چین۔ اور اگر آپ حضرات کی کرم فرمائیاں جاری ہیں تو جو کچھ رہا سہا ہے وہ بھی تشریف لے جاتا نظر آئے گا۔ بھئی خدا کے واسطے یہاں سے چلو۔ میرا تو دم اُلٹا جاتا ہے۔ جانتے ہو قلب کا مریض ہوں مجھے تو کچھ اختلاجی کیفیت سی محسوس ہو رہی ہے۔“

کمال : ”آپ کی واپسی کا انتظام کرائے دیتے ہیں، ہم لوگوں کو تو ابھی یہاں کام کرنا ہے۔ وہ دیکھئے ابھی ایک قافلہ آیا ہے خدا جانے اِس میں کتنے زخمی ہوں گے ان کے لیے طبی امداد کا انتظام کرنا ہے۔“

قاضی جی : ”بندہ نواز طبی امداد کا انتظام تو اصل میں میرے لیے کرنا پڑے گا اگر میں کچھ دیر اور یہاں رہا۔ قسم ہے خدا کی، خفقان ہو رہا ہے منظر کو دیکھ دیکھ کر، اور یہ جناب کی جو خدمات ہیں ان کی حیثیت اونٹ کے منہ میں زیرہ نہیں تو اور کیا ہے۔ بھلا غضب خدا کا ان لاکھوں آدمیوں کی دیکھ بھال کیوں کر ہو سکے گی۔“

اجمل : ”قاضی جی سب آپ ہی کے ایسے نہیں ہیں۔ خدا کے ایسے بندے بھی موجود ہیں جن کے دل میں دوسروں کے لیے بھی درد ہے۔“

قاضی جی : ”جی ہاں مثلاً آپ دونوں۔ مگر اس کا نتیجہ بھی ذرا آئینہ میں ملاحظہ فرمالیجیے۔ رُخ روشن پر وہ جھاڑو پھری ہوئی ہے کہ اگر آپ اس جنون سے صحت یاب نہ ہوئے تو مرغی بھی اپنی جان سے جائے گی اور کھانے والوں کو بھی سواد نہ ملے گا۔ رہ گیا آپ کا یہ خیال کہ آپ اتنے مہاجرین کو بٹور لیں گے اُن کے دکھ درد بٹالیں گے۔ ع

ایں خیال است و محال و جنوں۔“

کمال : ”سرکار یہ آپ اس لیے فرما رہے ہیں کہ آج پہلی مرتبہ یہاں تشریف لائے ہیں۔ اس بات کو تو کچھ وہی لوگ خوب جانتے ہیں جو خدمت کے لیے پہلے سے کچھ وقت دے رہے ہیں کہ ان حالات کو اتنے ہی دنوں میں کس حد تک قابو میں لایا جا چکا ہے اور بقول آپ کے کتنوں کو بٹورا جا چکا ہے۔ اب تو یہ کام کچھ بھی مشکل نہیں رہا۔ ایک نظم قائم ہو چکا ہے اور دیکھ لیجیے گا کہ انشاء اللہ بہت جلد ہی پریشان حال مہاجرین اسی پاکستان میں کیسی خوشحالی اور فراغت کی آزاد اور باعزت زندگی بسر کرتے ہیں۔“

قاضی جی : ”کاش ایسا ہو سکے۔ مگر نظر تو یہ آ رہا ہے کہ ان کے علاوہ خود ہم کو بھی آپ اسی رنگ میں رنگ کر چھوڑیں گے۔ میں تو یہ پوچھتا ہوں کہ آپ لوگوں کے علاوہ مجھے تو یہاں نہ وہ بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے افسر دکھائی دیتے ہیں جن کا اصل میں یہ کام ہے کہ اس حالت کو درست کریں، نہ وہ وردیوں میں اکڑنے والے ہیں، جن کی ڈیوٹی محض رعب جمانا ہے۔ آپ ہی لوگ کچھ خدائی فوجدار بنے ہوئے ہیں۔“

اجمل : ”جی نہیں ان میں سے بھی بہت سے لوگ مل جائیں گے اسی جگہ کسی نہ کسی کام میں مصروف اور اگر نہ بھی ہوں تو یہ کام صرف ان ہی کا تو نہیں ہمارا آپ کا سب کا ہے۔“

قاضی جی : ”جی خدا نہ کرے میرا یہ کام ہو۔ میں تو دوسرے ہی دن کپڑے پھاڑ کر نکل بھاگوں۔ مجھ کو تو آپ زیادہ سے زیادہ کوئی ایسا کام بتائیے جو ذرا معقول قسم کا ہو جو اپنے قابو میں آ سکے۔ یہاں تو میں کیا میرے

فرشتے بھی کوئی کام نہیں کر سکتے۔ انسان حیران رہ جائے کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ میرے نزدیک تو سب سے مقدم اور سب سے بڑا کام یہاں صرف یہ ہونا چاہیے کہ ہزار ہزار دو دو ہزار کے قافلے یہاں سے چلتے کیجیے۔ ورنہ اپنی جان بچانا مصیبت ہو جائے گی۔ مگر ان سے پہلے فی الحال مجھ کو تو چلتا کیجیے۔''

کمال : ''میری بھی رائے یہی ہے کہ آپ واقعی تشریف لے جائیں۔ اس لیے کہ آپ کی موجودگی ہم کو بھی کچھ نہ کرنے دے گی۔''

قاضی جی : ''بسم اللہ۔ اب آپ سر کھپایئے۔ میں اجازت چاہتا ہوں۔ ہاں وہ کہنا یہ تھا کہ بھئی اگر کوئی مناسب سا لڑکا سودا سلف لانے کے یہاں سے مل سکے تو خیال رکھنا۔ باقی۔ السلام علیکم۔''

(۳)

(قاضی جی گھبرائے ہوئے داخل ہوتے ہیں)

قاضی جی : ''میں نے کہا سنتی ہو۔ ارے بھئی یہ ہو کدھر آخر۔ یعنی لاحول ولاقوۃ۔ ارے بھئی جواب تو دو۔''

ملازم : ''جی سرکار۔''

قاضی جی : ''سرکار کا بچہ گھنٹہ بھر سے چیخ رہا ہوں اب جناب تشریف لائے ہیں رسید دینے۔ کہاں ہیں بیگم صاحب؟''

ملازم : ''سرکار وہ بیگم صاحب۔ جی ہاں بیگم صاحب تو کھانا کھلانے گئی ہیں۔''

قاضی جی : ''کیا بکتا ہے۔ کھانا کھلانے کس کو گئی ہیں۔''

ملازم : ''سرکار پڑوس میں جو عورتیں ٹھہرائی گئی ہیں نا۔ پناہ گیر عورتیں۔ ان ہی کے لیے سویرے سے بیگم صاحبہ کھانا پکا رہی تھیں۔ اب تیار ہوا ہے تو لے کر گئی ہیں۔''

قاضی جی : ''کھانا پکا رہی تھیں۔ کھانا لے کر گئی ہیں۔ کچھ دماغ تو نہیں ٹل گیا ہے تیرا۔ ان کو ان باتوں سے کیا مطلب۔ اور آخر کہا تھا کس نے اُن سے کہ اس مفلسی میں آٹا گیلا کرنے بیٹھ جائیں۔ جنس کہاں سے آئی تھی بھلا؟''

ملازم : ‘‘آٹا اور دال تو گھر ہی میں تھا۔ دس سیر گوشت میں لے آیا تھا بازار سے۔’’

قاضی جی : ‘‘ایں کیا کہا؟ دس سیر گوشت۔ کچھ بھنگ تو نہیں کھا گیا ہے۔ کبھی جو تو نے کوئی گت کی بات کی ہو۔ پانچ سال سے آپ ملازم ہیں اور بات تک کرنے کا سلیقہ نہ آیا جانور کہیں کا۔ پاؤ آدھ پاؤ کہتا تو ایک بات تھی۔ ایک دم سے آپ فرماتے ہیں علی الحساب دس سیر گوشت۔

(بیوی داخل ہوتی ہے)

بیوی : ‘‘یہ آخر قیامت کیا آئی ہوئی ہے۔ ہوا کیا آخر۔’’

قاضی جی : ‘‘ہوتا کیا، میرا سر ہوا ہے۔ ایک تو بھوک میں بولایا ہوا میں آیا۔ اوپر سے ملازم صاحب فرماتے ہیں کہ گویا یکمشت تم نے دس سیر گوشت منگا کر پکا ڈالا۔ اور کھانا کھلانے گئی ہو پناہی عورتوں کو۔’’

بیوی : ہاں ہاں تو آخر یہ کون سی ایسی مصیبت کی بات ہوگئی۔’’

قاضی جی۔ ‘‘کیا مطلب؟ یعنی آپ کے نزدیک یہ کوئی مصیبت کی بات ہی نہیں ہوئی۔ تو کیا واقعی تم کھانا کھلانے گئی تھیں۔’’

بیوی : ‘‘گئی تو تھی۔ اس وقت اسی گھر سے کھانا جانے کی باری تھی۔

قاضی جی : ‘‘گویا مہینہ بھر کا پورا راشن ختم۔ چلیے چھٹی ہوئی۔ اب چلیے ہم لوگ بھی وہیں چلیں اور جب دوسرے گھروں سے کھانا آیا کرے گا تو کھا لیا کریں گے۔ تمام دنیا میں اس وقت یہ ہو رہا ہے کہ وقت بے وقت کے لیے راشن بچا بچا کر رکھا جا رہا ہے اور ہمارے گھر میں لنگر خانے کھولے جا رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں آخر یہ حماقت کیا تھی۔’’

بیوی : ‘‘خدا کے لیے اتنی اونچی آواز میں اتنی گری ہوئی باتیں تو نہ کرو۔’’

قاضی جی : ‘‘لیجیے وہاں شروع ہوگئی شاعری کہ اونچی آواز میں گری ہوئی باتیں، اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آخر اب ہوگا کیا۔ مہینہ کیسے کٹے گا۔ راشن اب کہاں سے آئے گا۔ جانتی ہیں کہ کیسا زمانہ آ لگا ہے۔ دانہ دانہ پر مہر ہے۔ خدا جانے کیا کیا جتن کرنا پڑتے ہیں اس راشن کمبخت کے لیے تب کہیں جا کر پیٹ کو روٹی نصیب ہوتی ہے۔ ارے صاحب ہم تو مہاجر بھی نہیں کہ کوئی آ کر ہم کو کھلا جائے گا۔’’

بیوی : ‘‘توبہ ہے اللہ۔ میں نہ تم سے راشن کو کہوں گی نہ تم راشن لائے بغیر بھوکے رہو گے۔ میں نے جو راشن بچا بچا کر رکھا تھا۔ اُسی سے کام نکالا ہے۔’’

قاضی جی : ‘‘ایسی باتیں کر کے اور بھی جان جلا دیتی ہو۔ بچا کر اس لیے رکھا تھا کہ یوں ضائع کر دو۔’’

بیوی : ‘‘خدا کے غضب سے ڈرو۔ اس کو ضائع کرنا کہتے ہو۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ بچا ہوا راشن نہ بھی ہوتا تو اپنا پیٹ کاٹ کر ان بیچاریوں کو میں ضرور کھلاتی۔ ہائے ہائے کیسی مصیبت کی ماریاں ہیں ان میں۔’’

قاضی جی : ‘‘استغفر اللہ! جس مصیبت سے میں باہر کتراتا پھر رہا تھا وہ مجھ کو کیا معلوم تھا کہ میرے ہی گھر میں تشریف فرما ہے۔ مگر صاحب کان کھول کر سن لیجیے کہ اس بوڑھاپے کی کمائی میں آپ اس برکت کی امید نہ رکھئے جو اگلے زمانے میں تھی۔ میری سب سے پہلی بیوی خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے یوں تو بڑی سگھڑ تھیں مگر ان کی اسی عادت نے کبھی پنپنے نہ دیا کہ جو کچھ ہوتا تھا

ادھر اُدھر دے دلا کر بیٹھ رہتی تھیں۔ مگر وہ زمانہ بھی دوسرا تھا ہن برس رہا تھا ہن۔ اس وقت تو اللہ کے فضل سے یوں ہی جھاڑو پھری ہوئی ہے۔ عزت آبرو کی روٹی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ اوپر سے اگر آپ کی یہ سخاوت جاری رہی تو بدھیا ہی بیٹھ جائے گی۔''

بیوی : ''سخاوت کی بات نہیں ہے ہمدردی بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ میں مزے سے پیٹ بھر کھالوں اور وہ بیچاریاں جو اپنا سب کچھ لٹا کر یہاں آئی ہیں اپنے پاکستان پہونچ کر بھی فاقے کریں۔''

قاضی جی : ''یہ یہ پہونچ گیا صاحب پاکستان اس گھر میں بھی اور اب نکلا دیوالہ اچھی طرح۔ مگر میں صاف کہے دیتا ہوں کہ مجھ میں اتنا بوتا نہیں ہے کہ بیوی سے لیڈری کراؤں اور خود انتقال کرتا رہوں۔ یہاں دم نکلا ہوا ہے اسی خیال سے کہ ہونے والا کیا ہے۔ گرانی روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے آمدنی ظاہر ہے کہ جتنی تھی اتنی ہی ہے اور آپ چلی ہیں قومی کام کرنے۔ ارے صاحب قوم پر سب سے بڑا احسان یہی ہے کہ ہم خود فاقے نہ کریں لیکن تم گت بھی بنا کر چھوڑو گی اور پھر نچواؤ گی مجھ کو بھی پناہیوں کے کیمپ میں۔''

بیوی : ''ہاں اور کیا ہفتہ میں ایک دن چند پناہی عورتوں کے لیے کھانا چلا جایا کرے گا تو یہ بیچارے پناہیوں کے کیمپ میں، اللہ نہ کرے چلے جائیں گے۔''

قاضی جی : ''ایں؟ کیا مطلب یعنی ہفتہ میں ایک روز سے کیا مطلب ہے تمہارا؟

گویا ہر آٹھویں دن یہ سلسلہ جاری رہے گا۔''

بیوی : ''ہاں یہی طے ہوا ہے سولہ گھروں سے کھانا باری باری جائے گا۔ ہفتہ میں ایک وقت کے کھانے کی باری ہماری بھی ہے۔''

قاضی جی : ''میں کہتا ہوں یہ آخر تم کو ہو کیا گیا ہے۔ کیا واقعی آنکھوں پر چربی چھا گئی ہے یا قطعی ارادہ یہ ہے کہ میری جان لے کر رہو گی۔ میں آخر کہاں سے لاؤں گا ہر ہفتہ یہ فیاضی کرنے کے لیے۔ اور اگر یہ آپ مذاق فرما رہی ہیں تو سبحان اللہ عجیب پاکیزہ اور جان لیوا مذاق ہے۔''

بیوی : ''نہ میں مذاق کر رہی ہوں نہ کچھ اور، نہ میں تم سے کہتی ہوں کہ تم اس سلسلہ میں زیادہ راشن کا انتظام کرو۔ مجھ سے جس طرح بھی ہوگا میں انتظام کروں گی۔ وقت ہی ایسا آپڑا ہے کہ اگر اس وقت سب مل کر اپنی ایک ایک روٹی بھی ان لوگوں کے لیے بچائیں تو یہ بیڑا پار ہوجائے۔''

قاضی جی : ''بیڑا تو پار ہوجائے گا مگر میں ڈوبا۔ خدا کے واسطے عقل سے کام لے کر یہ تو سوچو کہ یہ لوگ ہیں مہاجر، جن کے کھانے پہننے کا انتظام سب ہی کر رہے ہیں صرف ہم ہی نہیں رہ گئے ہیں کہ یہ طوطا بھی پال کر بیٹھ رہیں۔''

بیوی : ''کیسی باتیں کہہ رہے ہو۔ اگر تمہاری ہی طرح سب نے اسی قسم کی باتیں سوچیں تو کیا ہوگا۔ یہ وقت سب کے کام کرنے اور کام آنے کا ہے۔ اگر سب ایک دوسرے کے بھروسے پر رہے تو کیا حال ہوگا ان بیچاروں کا۔''

قاضی جی : ''کچھ بھی حال نہ ہوگا۔ ان ہی لوگوں کے لیے خدا جانے کتنا روپیہ قائداعظم کے فنڈ میں جمع ہو چکا ہے۔ آخر وہ کیوں نہ صرف کیا جائے ان لوگوں پر۔''

بیوی : ''اور کیا جیسے وہ صرف تھوڑی ہو رہا ہے۔ وہ روپیہ صرف نہ ہوتا تو ہر جگہ جو لاکھوں مہاجر پہنچ چکے ہیں ان کا پورا کہیں اس طرح پڑ سکتا تھا۔ ضرورت تو اس کی تھی کہ یہ کھانے پینے کی ضرورت ہم سب مل کر پوری کرتے۔ اور وہ روپیہ اجڑے ہوؤں کو بسانے کے بڑے کام میں صرف ہوتا۔''

قاضی جی : ''خدا کے واسطے میرے سامنے ایسی ہولناک باتیں نہ کرو۔ مجھ کو تو اس وقت صرف یہ فکر ہے کہ باہر تک تو غنیمت تھا کہ یہ چرچے تھے۔ مگر اب کہاں ٹھکانہ رہے گا جب گھروں میں بھی گھر کی بیٹھنے والیاں لیڈری شروع کر دیں گی۔''

بیوی : ''لیڈری تو اس کو تم سمجھو، مگر باہر تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ یہ کام گھروں میں نہ شروع ہوں گے اور اگر سچ پوچھو تو یہ مہاجرین کا قصہ تو آج ختم ہوسکتا ہے اگر پاکستان کے تمام شہری ان کی مہمان نوازی کو اپنے اوپر فرض کر لیں۔''

قاضی جی : ''کمانا دوسری چیز ہے اور اڑانا دوسری چیز۔ بیگم صاحب سر کا پسینہ ایڑی کو آتا ہے جب چار پیسے کمائے جاتے ہیں۔ اور کمائی تو گئی جہنم میں، سوال تو یہ ہے کہ جتنا راشن بندھا ہوا ہے اِس سے زیادہ آئے گا کہاں سے۔''

بیوی : ''یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی عورتیں صرف کرنا بھی جانتی ہیں

اور اُن ہی کو بچانے کا گُر بھی آتا ہے۔ جب تم تے زیادہ لانے کو کہیں۔ اُسی وقت اُلجھ لینا۔''

(باہر سے آواز آتی ہے) ''اخبار والا۔ اخبار لے جایئے۔''

قاضی جی .. ''خبردار۔ بس بند اخبار۔ اس اخبار ہی نے گھر میں آ کر یہ دن دکھایا ہے۔ ٹھہرو اخبار والے میں آیا ابھی۔''

(جاتے ہیں)

(۴)

(کچھ چیزوں کو اِدھر اُدھر رکھنے کی آواز)

قاضی جی : ''یہ کیا۔ ارے بھئی یہ کیا واہیات ہے یعنی اب اس نئے مکان کو بھی آپ کا ارادہ ہے کہ اُسی نامعقول مکان کی طرح اصطبل بنا کر رکھ دیں گی۔ خدا کے واسطے یہ آخور اس کمرے سے ہٹایئے۔ چہ خوش کجا۔ یہ اعلیٰ درجہ کا ڈرائینگ روم کجا جناب کا یہ تاریخی نعمت خانہ۔ ارے بھئی پھینکو نا اس کباڑ کو۔''

بیوی : ''کیا کہنا ہے تمہارا۔ میرا یہ طریقہ نہیں کہ بادل دیکھ کر گھڑے توڑنے لگوں۔ لو اور سُنو نعمت خانہ اٹھا کر پھینک دوں اور پھر جو ضرورت پڑے نعمت خانہ کی تو بغلیں جھانکتی پھروں۔''

قاضی جی : ''عجیب چیز ہیں آپ۔ یعنی اتنی اتنی بڑی الماریاں آپ کو نظر نہیں آرہی ہیں۔ باورچی خانہ میں جالی لگی ہوئی الماریاں اسی لیے ہیں کہ اسی قسم کے نامعقول نعمت خانے نہ رکھے جائیں۔ جن سے ہم لوگوں کے کباڑیہ ہونے کا شک کیا جاسکے۔''

بیوی : ''حلوائی کی دوکان دادا جی کا فاتحہ۔ پرائے مکان کا سامان دیکھ کر اپنا سامان پھنکواتے ہوئے ان ہی کو دیکھا ہے۔ یوں تو الماریاں کیا معنی نعمت خانہ بھی رکھا ہوا ہے بالکل نیا۔''

قاضی جی : ''پھر تو اور بھی جناب اپنی حماقت کا ثبوت دے رہی ہیں۔ ارے صاحب اِس نعمت خانہ کو رکھئے اُس نئے نعمت خانہ کی جگہ پر اور اُسکو لایئے اپنے کام میں۔''

بیوی : ''خواہ مخواہ اپنے کام میں لاؤں۔ ایک تو یہ کہ وہ پرائی چیز۔ دوسرے یہ کہ فہرست میں وہ لکھا ہوا ہے۔''

قاضی جی : ''بھئی خدا کے واسطے تم مجھ سے بحث نہ کرو۔ ہزار مرتبہ کہہ دیا کہ ایک مرتبہ بیٹھ کر اس بات کا فیصلہ کرلو کہ عقل مند کون زیادہ ہے میں یا تم۔ مگر یہ فیصلہ نہ آج ہوتا ہے نہ کل۔ نتیجہ یہ کہ ہر معاملہ میں تم دخل دیتی ہو۔ نہ سمجھو نہ بوجھو مگر مگر رائے زنی سے مطلب۔ کیا مجھ کو نہیں معلوم ہے کہ فہرست تیار ہوچکی ہے۔ لیکن شاید جناب کو یہ نہیں معلوم کہ ان چیزوں کو استعمال کرنے کی ہم کو اجازت ہے۔ دوسرے نہ بھی اجازت ہو تو فہرست میں لکھا ہوا ہے۔ صرف نعمت خانہ۔ نہ نعمت خانہ کی ولدیت لکھی ہے نہ سکونت نہ قوم کہ صاحب یہ نعمت خانہ نہیں وہ ہے۔''

بیوی : ''ہائے میرے اللہ۔ تمہارا مطلب یہ ہے کہ ذرا سی چیز کے لیے اس طرح بے ایمانی۔''

قاضی جی : ''لیجئے اب وہاں مذہب اور اخلاق۔ ایمانداری اور بے ایمانی شروع ہوگئی۔ خدا جانتا ہے ناطقہ بند کردیا۔ تمام دنیا میں اِس وقت یہ سمجھا جارہا ہے کہ جو کچھ مل جائے وہی غنیمت ہے۔ ہر طرف زبردستی کی لوٹ مار ہو رہی ہے ذرا باہر نکل کر تو دیکھو اُن بے چارے مسلمانوں کو جو لٹ لٹا کر آئے ہیں۔ کسی کی ایک چیز بھی نہیں چھوڑی گئی۔ اور

جناب ہیں کہ ذرا سے نعمت خانہ کا تبادلہ کرتے ہوئے ہائے اللہ اور اُوئی اللہ شروع کر دیا۔ رکھو اس نعمت خانہ کو نعمت خانہ کی جگہ۔''

بیوی : ''رکھو نہ رکھو تم جانو میرا ہاتھ کیوں اس بے ایمانی میں لگواتے ہو۔ میں تو اسی وجہ سے اس مکان میں آنے کو تیار نہ تھی۔ وہاں ہر تکلیف تھی مگر ایمان تو سلامت تھا۔''

قاضی جی : ''نالی کے کیڑے کو مشک کی ڈبیا میں بند کر دو۔ نتیجہ یہ کہ پھڑ پھڑا کر اس کا دم نکل جائے۔ جناب کو عادت پڑی ہوئی ہے اِس مال گودام کی، بھلا یہ صاف شفاف کشادہ اور شاندار مکان کیسے پسند آ سکتا ہے۔ بجائے اس کے کہ شکر کرتیں کہ صاحب اب آدمیوں کی طرح زندگی بسر ہو سکے گی۔ لیٹنے کا کمرہ الگ ہے مسہریاں لگی ہوئی ہیں۔ سنگا میز ایک سے ایک موجود ہے۔ کھانے کے کمرے میں فرنیچر کے علاوہ اچار اور مربّے تک مکان کے ساتھ ملے ہیں۔ بیٹھنے کے کمرے میں ایک سے ایک صوفہ۔ اور سب بڑھ کر یہ کہ اُس سامنے والے کمرے میں جو سامان ہے وہ فہرست میں لکھا ہی نہیں گیا۔''

بیوی : ''لہٰذا وہ سب تمھارا ہے۔''

قاضی جی : ''اور نہیں تو کس کا ہے۔ ہے تو خیر یہ سب سامان بھی اپنا۔ دیکھ لینا اپنے کاٹ کباڑ سے ہر چیز کو بدل لوں گا۔ مسہریاں لکھی ہیں تو مسہریاں ہم دیں گے۔ میز کی جگہ میز ہم سے لیں۔ کرسی کی جگہ کرسی نہ دیں تو جو چور کی سزا وہ ہماری۔

بیوی : ''اللہ تمہاری نیت پر رحم کرے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے خدا کو منہ دکھانا ہی نہیں ہے۔ یہ بھی خبر ہے کہ اس قسم کی چیز خود اپنے پاس بھی رہنے نہیں پاتی۔''

قاضی جی : ''پھر وہی دقیانوسی باتیں تم نے شروع کیں۔ ہزار مرتبہ کہا کہ فرصت کے وقت کچھ پڑھا کرو اور اب تو اس مکان میں الماریوں کی الماریاں کتابوں سے بھری پڑی ہیں۔ اگر ذرا بھی اِس طرف توجہ کرو گی تو کم سے کم ایسی کڑھ مغزی کی تو باتیں تو نہ کرو گی۔ اب سے پچاس برس پہلے بھی کم سے کم اس سے نئی باتیں میں سنایا کرتا تھا۔ ارے صاحب یہ وقت ان باتوں کو سوچنے کا نہیں ہے۔ تم کو کیا معلوم کہ مسلمانوں کو کس بری طرح بے سر و سامان کیا گیا ہے۔''

بیوی : ''خدا کے غضب سے ڈرو۔ ایک تو لٹے ہوئے مہاجرین کے لیے بھی یہ بات جو ناجائز ہے جائز نہیں بن جاتی۔ دوسرے تم کونسے مہاجر ہو۔ اللہ نہ کرے تم کب لٹے ہو۔ تمہارا کونسا سامان گیا ہے۔''

قاضی جی : ''کیا مطلب؟ یعنی میں گویا مسلمان نہیں ہوں۔ مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا ہے اس سے میں الگ ہوں۔ میں مہاجر نہ سہی مگر مہاجرین کا بھائی ہوں۔ وہ بھی تو آخر مسلمان ہی ہیں اور ان کو جو نقصان پہنچا ہے وہ اسی لیے تو پہنچا ہے کہ وہ مسلمان تھے۔''

بیوی : ''اب اس وقت مہاجروں کے بھائی بھی بن گئے اور ان کا نقصان بھی ان کا بن گیا - اور ذرا مہاجرین کی مدد کا سوال آ جائے تو۔''

قاضی جی : ''خیر۔ خیر۔ نہ میرے پاس اِس لغویت میں سر کھپانے کا وقت ہے اور نہ میری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ آخر تم میری ہر بات میں اتنی مخالف کیوں ہو جاتی ہو۔ تمام دنیا کی بیویاں اپنے شوہر کی ہم دم اور دمساز ہوتی ہیں۔ رفیق تنہائی اور نہ جانے کیا کیا خاک دھول الم غلم ہوا

کرتی ہیں مگر ہماری بیگم صاحب ہیں کہ سوائے شوہر کی اُستانی ہونے کے اور کچھ نہیں ہیں۔ ارمان رہ گیا کہ کبھی تو میرے کسی کام میں ہاتھ بٹاؤ گی۔ تم کو معلوم بھی ہے کہ میں تمہارا مجازی خدا تک ہوں۔''

بیوی۔ ''اسی لیے تو میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی نیت کو پاک رکھو۔ اب جو اس مکان کے سامان پر تمہاری نیت ڈانواڈول ہو رہی ہے اِس بات پر تم کو شاید ندامت نہ ہوتی ہو۔ مگر مجھ کو بے حد شرم آتی ہے۔''

قاضی جی : ''اچھا اب مہربانی فرما کر چھوڑیے اس شرم اور ندامت کو اور عقل سے کام لے کر ذرا اُس کمرہ کی چیزوں کو سنبھالیے۔ شیشوں سے جھانک کر دیکھا تھا تو بظاہر بہت کچھ نظر آ رہا تھا اُس میں۔ رہ گئی ایمانداری اور بے ایمانی اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت تمام دنیا میں یہی ہو رہا ہے۔''

بیوی : ''نہ تمام دنیا میں یہ ہو رہا ہے اور نہ تمام دنیا میں اِس قسم کی بددیانتی ہونے سے اس کو ایمانداری کہا جا سکتا ہے۔ خیر مجھ کو ان جھگڑوں سے مطلب نہیں مگر میں صاف کہے دیتی ہوں کہ میں ان چیزوں کو ہاتھ نہ لگاؤں گی تم جانو تمھارا کام جانے۔''

قاضی جی : ''پھر وہی استغفراللہ۔ خدا نہ کرے کہ کسی کج بحث سے پالا پڑ جائے۔ گویا اتنا سامان جو اِس طرح ہاتھ آ رہا ہے اس کو محض بیوی کی حماقت سے چھوڑ دیا جائے۔ کم سے کم میں ایسا زن مرید نہیں ہوں۔''

بیوی : ''نہیں ہو تو اللہ مبارک کرے تم کو یہ عاقبت کا سامان بٹورنا میں باز آئی۔ اور اگر اس سلسلہ میں مجھ کو زیادہ مجبور کرو گے تو میں بھیا کے یہاں پہنچ جاؤں گی تاکہ تم جی کھول کر اپنے حوصلے نکال لو۔''

قاضی جی : ''صاحب عجیب قماش کی عورت ہے۔ یعنی ان ہی کے آرام کے لیے ہم نے ایک ایک کی خوشامد کی۔ للو پتو کی کہ کوئی ایسا مکان مل جائے۔ جس میں کچھ اور بھی مل سکے۔ اپنے اثر اور رسوخ سے کام لے کر مکان لیا تو بیوی صاحب کے دماغ میں دیانت داری کے کیڑا رینگ رہا ہے۔ میری طرف سے جہنم میں جاؤ تم، تمہارے ہی لیے سب کچھ کیا تھا۔ مگر تم اپنی قسمت سے مجبور ہو۔''

بیوی : ''اللہ نہ کرے میری قسمت میں بے ایمانی کا یہ عیش ہو۔ مجھے ایمانداری کی تکلیف منظور ہے۔''

قاضی جی : ''منظور ہے تو مرو اور بھرو۔ اس عورت نے میری بھی زندگی وبال کر رکھی ہے۔ اس سے تو خدا موت ہی دیدیتا۔''

(نکل جاتے ہیں)

(۵)

(اجمل دروازے پر دستک دیتا ہے)

اجمل : ‘‘جناب قاضی جی! قاضی جی تشریف رکھتے ہیں؟’’

قاضی جی : ‘‘(اندر ہی سے) میں نے کہا سنتی ہو۔ ذرا دیکھنا کون ہے۔ شاید پوسٹ مین ہو۔’’

اجمل : ‘‘(بلند آواز سے) پوسٹ مین نہیں یہ آپ کا خادم ہے اجمل۔’’

قاضی جی : ‘‘اجمل صاحب۔ ارے بھئی تو آجاؤ نا۔’’

اجمل : ‘‘(آتے ہوئے) آداب بجالاتا ہوں۔ تسلیم بھابی جان۔’’

بیوی : ‘‘بہت دنوں میں صورت دکھائی اجمل بھائی آپ نے۔’’

قاضی جی : ‘‘اب بھی پوچھا تو مہربانی کی۔ مگر خیر آپ سے شکوہ ہی بیکار ہے۔ پنجابی احباب اب اس سے زیادہ بھی کیا اخلاق برت سکتے ہیں۔’’

اجمل : ‘‘دیکھئے قاضی جی آپ نے پھر وہی صوبجاتی بحث چھیڑ دی۔ کئی مرتبہ آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ اب نہ کوئی پنجابی ہے نہ بنگالی، نہ لکھنوی ہے نہ دہلوی، بلکہ سب پاکستانی ہیں۔ پاکستان بننے کا کم سے کم یہ فائدہ تو اٹھایئے کہ اس صوبجاتی لغویت کو بھلا دیجئے۔’’

قاضی جی : ‘‘کیسے بھلا دوں بندہ نواز۔ اسی کو بیٹھا ہوا جھینک رہا ہوں۔ ذرا

ملاحظہ کیجیے اس درخواست کو۔’’

اجمل : ‘‘یہ کیا ہے۔’’

بیوی : ‘‘سوداگری کا ارادہ ہوا تھا۔ بساط خانہ کی دوکان کے لیے عرضی دی تھی وہ نامنظور ہو گئی۔’’

قاضی جی : ‘‘اور نامنظور اس لیے ہو گئی کہ میں بدقسمتی سے پنجابی نہیں ہوں۔ تقسیم کرنے والے ٹھہرے پنجابی۔ ایک پنجابی سے اگر فائدہ پہونچ سکتا ہے تو صرف پنجابی کو۔ اندھا بانٹے ریوڑیاں ہر پھر کے اپنوں کو۔ اگر میں بھی سر پر طرے دار صافہ باندھ کر اور پیروں میں وہ بادبان نما شلوار پہن کر۔ ‘‘کی گل اے بادشاؤ’’ کہتا ہوا جاتا تو یہی نامنظور ہونے والی درخواست فوراً منظور ہو جاتی۔’’

بیوی : ‘‘اب ایسا اندھیر بھی نہیں ہے۔’’

قاضی جی : ‘‘لاحول ولاقوۃ۔ صاحب عجیب مرض ہے آپ کو بھی نہ سمجھیں نہ بوجھیں دخل در معقولات سے مطلب۔ تم کیا جانو گھر کی بیٹھنے والی کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ مگر پٹ سے بولیں گی ضرور۔’’

اجمل ‘‘قاضی جی یہ آپ کا محض خیال ہے کہ آپ کی درخواست پنجابی نہ ہونے کی وجہ سے نامنظور ہوئی ہے۔’’

قاضی جی : ‘‘مجھ کو جناب سے درخواست نامنظور کرنے والوں کی اسی طرفداری کی امید تھی۔ کیا مجال کہ کوئی پنجابی کسی دوسرے پنجابی کی کبھی مخالفت تو کر جائے۔ یہ پھوٹ تو ہم یو۔ پی والوں ہی کی قسمت میں لکھی تھی کہ اپنی ذاتی بیوی ہیں مگر کیا مجال جو کبھی مجھ نامراد شوہر کی کبھی تائید کر جائیں۔ تو جناب کا خیال یہ ہے کہ اس درخواست کے نامنظور

ہونے کی اس کے علاوہ بھی کوئی وجہ ہو سکتی ہے مثلاً؟''

بیوی : ''مثلاً یہ کہ تمہاری کون سی بساط خانہ کی دوکان تھی جو پاکستان کے باہر تم چھوڑ کر یہاں آئے ہو۔''

قاضی جی : ''ملاحظہ فرما لیجیے اس بغلی گھونسے کو، اور مشہور یہ ہے کہ جناب میری رفیقۂ حیات ہیں۔ ارے بھئی اگر تم کو مجھ ناشدنی سے کچھ للّٰہی عداوت ہے تو صاف کہدو۔ آخر میرے خلاف اس زہر کے اگلنے سے کیا فائدہ۔''

اجمل : ''قاضی جی آپ کو تو خواہ مخواہ غصہ آ رہا ہے حالانکہ بھابی نہایت معقول بات کہہ رہی ہیں۔''

قاضی جی : ''بجا ارشاد۔ وہ آپ کی تائید کر رہی ہیں نا۔ بھلا اس سے زیادہ معقول بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ نامعقولیت تو اسی خاکسار پر ختم ہے۔ یعنی کھلا ہوا صوبجاتی تعصب ہے۔ آپ لوگ یہ تو دیکھ ہی نہیں سکتے کہ کوئی غیر پنجابی کسی حیثیت سے آپ کے پنجاب میں قدم جمانے کے قابل ہو جائے۔ آنکھ بند کر کے دوکانیں دی گئی ہیں۔ اجی دوکانیں تو دوکانیں فیکٹریاں کھلوا دی گئی ہیں۔ مگر ہم گویا ایسے گئے گذرے تھے کہ معمولی سی بساط خانہ کی دوکان تک کے قابل ہم کو نہ سمجھا گیا۔''

اجمل : ''ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجیے قاضی جی کہ آپ نے بساطی ہونے کا کبھی بھی کوئی تجربہ حاصل کیا ہے۔''

قاضی جی : ''اجی لاحول ولا قوۃ۔ یہ تو وقت کی بات ہے کہ اس طرف خیال بھی گیا ورنہ آپ کو معلوم ہے کہ ہاتھی لاکھ لٹے سوا لاکھ ٹکے کا ہوتا ہے۔ یقین فرمائیے گا کہ ایسی ایسی چھوٹی موٹی دوکانیں تو ہمارے یہاں خوشی ہو

کرانادن دواؤں کے بچوں کو کھلوا دیا کرتے تھے۔ مگر میں نے سوچا کہ اس طرح بیکار بیٹھنے سے کیا حاصل۔ ارے بھئی اس وقت آسانی سے دوکان مل سکتی ہے تو کیوں نہ حاصل کر لی جائے۔ کیا عجب ہے کہ اسی بہانے قسمت پلٹ جائے اور وہ دن پھر آ جائیں۔ تو جناب اس درخواست کا یہ حشر ہوا۔''

بیوی : ''پھر میں کچھ کہوں گی تو برا مان جاؤ گے۔ میں نے پہلے ہی تم کو سمجھایا تھا کہ یہ دوکانیں صرف ان لوگوں کو مل سکتی ہیں جو اپنا یہی کاروبار چھوڑ کر یہاں آ گئے ہیں۔ اور سوائے اس کام کے اور کوئی کام نہیں کر سکتے۔''

قاضی جی : ''جناب کے اس مشورے کا شکریہ ادا کرنا اگر اس وقت میں بھول گیا تھا تو اب ادا کرتا ہوں۔ آپ مہربانی فرما کر چائے کا انتظام کیجیے۔ یہ باتیں نہ آپ کی سمجھ میں آئی ہیں نہ آئیں گی۔ آپ کا صرف ایک مقصد ہوتا ہے کہ اس کمبخت کی جس طرح بھی ہو سکے بس مخالفت کرو۔ نہ جانے کون سا باپ مارے کا بیر باندھ رکھا ہے۔ جرم صرف ایک کیا تھا یعنی آپ سے عقد، اور سزا اس کی یہ بھگتنا پڑی کہ زندگی عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ بھلا غضب خدا کا اس مخالفت کی بھی کوئی انتہا ہے۔ ارے صاحب شوہر نہ سہی مجھ نامراد کو اپنے صوبے ہی کا ایک باشندہ سمجھ کر اس غربت میں طرفداری کر لی ہوتی۔''

اجمل : (قہقہہ لگا کر) ''کیا باتیں ہیں قاضی جی کی بھی۔''

بیوی : ''سچ مچ یہ سٹھیاتے جاتے ہیں روز بروز۔ کوئی پوچھے ان سے کہ یہ غربت ہے ہی کب۔ اب اپنا صوبہ ہے تو یہ، وطن ہے تو یہ، گھر ہے تو

یہ۔ پاکستان اس لیے تو لیا نہیں ہے کہ اس کو بھی غربت ہی سمجھتے رہیں گے۔‘‘

قاضی جی : ’’مصیبت تو یہ ہے کہ جناب واقع ہوئی ہیں کچھ لیڈر بھی۔ یہاں یہ حال ہے کہ پاکستان ملنے کے بعد بھی ہم پردیسیوں کی مٹی پلید ہے۔ ہم کو غیر پنجابی سمجھا جاتا ہے اور ہمارے مقابلہ میں ہر موقع پر پنجابی کو ترجیح دی جاتی ہے اور آپ چلی ہیں اپنی قابلیت بگھارنے۔ خدا کے واسطے تم جاؤ چائے لینے کے لیے۔‘‘

اجمل : ’’دیکھئے قاضی جی۔ سب سے پہلے تو آپ اپنے ذہن سے یہ خیال نکال دیجئے کہ اب کوئی پاکستانی کسی قسم کے نسلی، اعتقادی یا مقامی تعصب میں مبتلا ہے۔ اب تو پاکستان ہر مسلمان کا وطن ہے اور پاکستان پر ہر ایک کو یکساں حق حاصل ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’بندہ پرور اس سے زیادہ خوبصورت الفاظ میں اسی قسم کی تقریریں میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔ مگر اس کے برعکس تجربہ یہ ہوتا ہے کہ یہ درخواست دیکھ لیجیے کہ نامنظور ہوئی ہے یا نہیں۔‘‘

اجمل : ’’میں آپ سے عرض کروں۔ اس کو آپ ذرا صبر و سکون کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ پاکستان ملنے سے پہلے آپ کیا کرتے تھے۔‘‘

قاضی جی : ’’میں کیا کرتا جب تک ملازمت کر سکا ملازمت کی۔ اس کے بعد پنشن لے کر گھر بیٹھ رہا اور تھوڑی بہت جو زمینداری تھی اس کا انتظام کرنے لگا۔‘‘

اجمل : ’’اور اب آپ کرنا چاہتے ہیں دوکانداری؟‘‘

قاضی جی : ’’میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے آپ لوگ کرنے ہی نہ دیں گے۔‘‘

اجمل : ’’ذرا صبر کیجیے۔ سوال اب یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو اسی قسم کی دوکانیں لٹا کر یا چھوڑ کر پناہ گیر کی حیثیت سے پاکستان آئے ہیں۔ اگر ان کو یہ دوکانیں نہ دی جائیں گی تو وہ کیا کریں گے۔

قاضی جی : ’’یہی تو میں پوچھتا ہوں کہ ان کے کون سا سرخاب کا پر لگا ہے کہ بس ان ہی کو یہ دوکانیں ملیں۔‘‘

بیوی : ’’سرخاب کا پر یہ لگا ہے کہ وہ اس کام کی سمجھ رکھتے ہیں۔ وہ صرف یہی کام کر سکتے ہیں، وہ اس کام میں ترقی کر سکتے ہیں، ان کی وجہ سے کاروبار چلتے رہیں گے۔‘‘

قاضی جی : ’’گویا بغیر کسی تجربہ کے طے کر لیا گیا کہ میں محض اس لیے نالائق ہوں کہ پنجابی نہیں اور وہ ہر طرح اہل ہیں اس لیے کہ پنجابی ہیں۔ شلوار پہنتے ہیں۔ داڑھی میں مہندی لگاتے ہیں۔ چارپائی کو منجی اور بھینس کو مجھ کہتے ہیں۔‘‘

بیوی : ’’میں سچ کہتی ہوں کہ تمہاری اسی قسم کی باتیں پاکستان میں بھی پنجابی اور غیر پنجابی کے قصہ کو ختم نہ ہونے دیں گی۔‘‘

اجمل : ’’قاضی جی آپ الزام تو رکھ رہے ہیں ان لوگوں پر جن کو آپ پنجابی کہتے ہیں مگر صوبجاتی تعصب کا نمونہ خود پیش کر رہے ہیں۔ آخر بھابی کو بھی دیکھئے وہ بیچاری کس طرح سب کچھ بھول کر صرف پاکستانی بنی ہوئی ہیں۔‘‘

قاضی جی : ’’کون! یہ؟ ہائے ان کی پاکستان پرستی کا راز کوئی مجھ سے پوچھے۔ پنجاب کیا معنی ان سے کہیے تو میری مخالفت میں یہ تبت تک کی طرفدار ہو سکتی ہیں۔‘‘

بیوی : ''یہ تو خیر تمہارا خیال ہے۔ میں تو صرف یہ کہتی ہوں کہ اگر واقعی اب تک تمہارے دل میں پنجاب کے لیے کوئی جگہ نہ تھی تو اب اس لیے ہونا چاہیے کہ اپنا پاکستان یہاں بن گیا ہے۔ آخر میں بھی تو پنجابی نہیں ہوں۔ مگر میں تمہاری طرح کی باتیں کر کے پاکستان کو صرف پنجابیوں یا صرف بنگالیوں یا صرف سرحدیوں اور سندھیوں کا نہیں بنانا چاہتی۔''

اجمل : ''واہ واہ۔ کس قدر عمدہ بات کہی ہے بھابھی جان نے۔''

قاضی جی : ''کیا کہنا ہے بات کرنے والی دہ۔ داد دینے والے آپ۔

سید کی سرگذشت کو حالی سے پوچھیے
بالے میاں کا حال ڈفالی سے پوچھیے

بیوی : ''خیر یہی سہی۔ مگر تمہارا تو حال یہ ہے کہ اگر یہی اوندھی سیدھی درخواست منظور ہو جاتی تو پاکستان کے بھی قائل ہو جاتے اور پھر پنجابیوں سے کوئی تعصب بھی نہ ہوتا۔ درخواست منظور نہیں ہوئی ہے تو سب ہی میں کیڑے پڑ گئے۔''

قاضی جی : ''اب یہ گفتگو سُن کر کون نامعقول کہہ سکتا ہے کہ یہ محترمہ اس خاکسار کی زوجہ بھی ہو سکتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کمبخت کا کیا ٹھکانا ہو سکتا ہے جس کی شدید سے شدید مخالفت کے لیے خود اس کی بیوی ہی موجود ہو۔ میں کس منہ سے کسی کی شکایت کر سکتا ہوں۔ میری شامت اعمال تو میرے دم کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ نہ ان حکام سے کوئی گلہ ہو سکتا ہے جو درخواست نامنظور کر دیں۔ نہ کسی اور پنجابی سے شکایت ہو سکتی ہے۔ سو پنجابیوں کی ایک پنجابن تو خود رفیقۂ حیات واقع ہوئی ہیں جس کے لیے میں بساطی تک بننے کو تیار ہو گیا۔ مگر جب

ان ہی کو پروا نہیں ہے تو مجھ کو کیا کیا کسی دیوانے کتے کے کاٹا ہے کہ مرتا پھروں۔ میری طرف سے جہنم میں جائیں۔ ہر بات میں مخالفت، ہر بات میں عداوت، یہ بیوی ہیں صاحب ہماری۔ لعنت ایسے شوہر ہونے پر اور تف ہے اس زندگی پر۔''

(چل دیتے ہیں)

(۶)

(دروازہ پر دستک)

اجمل : ”جناب قاضی صاحب۔ قاضی جی تشریف رکھتے ہیں؟“

بیوی : ”کون اجمل بھائی؟ میں آ رہی ہوں دروازہ کھولنے۔“

اجمل : (داخل ہوتے ہوئے) آداب عرض بھابی۔ کہیے کیسے یاد فرمایا تھا اور ہمارے قاضی جی کہاں تشریف لے گئے؟

بیوی : ”کیا بتاؤں میں اجمل بھائی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میں ان کو سمجھاؤں کس طرح۔ اب یہ دھن سوار ہوئی ہے کہ کسی فلم کمپنی پر قبضہ مل جائے۔“

اجمل : ”فلم کمپنی پر قبضہ؟ اُن کو کیا معلوم کہ فلم کا سر کدھر ہوتا ہے اور دُم کدھر۔“

بیوی : ”یہی تو میں بھی کہتی ہوں کہ فلم کمپنی تو دوسری چیز ہے زندگی بھر میں مشکل سے دو تین تماشے دیکھے ہوں گے۔ مگر دعویٰ یہ ہے کہ فلم کمپنی اگر مل گئی تو جیسے دنیا ہی تو الٹ دیں گے۔“

اجمل : ”مگر یہ فلم کمپنی کی سوجھی کیسے؟“

بیوی : ”اللہ جانے فلم کمپنی نگوڑ ماری کا دورہ کیسے پڑ گیا ہے۔ دو دن سے نہ جانے کیا کیا خرافات لکھ رہے تھے۔ اب یہ رٹ ہے کہ فلم کمپنی لے کر

چھوڑوں گا۔ خدا جانے کیا کیا خیالی پلاؤ پکایا کرتے ہیں۔“

اجمل : ”اور تشریف کہاں لے گئے ہیں؟“

بیوی : ”جاتے کہاں اندر کمرے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ آؤ تم ہی کچھ سمجھاؤ۔ خدا کرے تمہاری ہی بات سمجھ میں آ جائے۔“

(دونوں جاتے ہیں)

قاضی جی : ”اخاہ۔ اجمل صاحب ہیں۔ بھئی خوب آئے۔ ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو نہایت ضروری مشورے کرنا ہیں۔ بلکہ اب یہ طے ہے کہ یا تو ہم دونوں بن گیے ورنہ جہاں ستیاناس وہاں ساڑھے ستیاناس سہی۔ مگر دوست پھڑک اُٹھو گے وہ ترکیب تمہارے اس ہیچمدان کے ذہن میں آئی ہے۔ قسم خدا کی سونے کی کان سمجھو سونے کی کان۔“

اجمل : ”اللہ مبارک کرے مگر کچھ معلوم تو ہو کہ واقعہ کیا ہے۔“

بیوی : ”فلم کمپنی کھل رہی ہے۔“

قاضی جی : ”کُھل رہی ہے یا یہ سمجھو کہ بس کُھل گئی۔ خدا جانتا ہے کہ اس سے زیادہ نفع کسی کاروبار میں نہیں ہے۔ مٹی سے سونا بنا لو۔ دیکھ لینا یہ دلدر دھل جائیں گے دن پلٹ جائیں گے۔ موٹریں اڑائے پھرو گے موٹریں۔ اماں میں تو یہ کہتا ہوں اجمل بھائی کہ زندگی گویا میں نے برباد کر دی اور یہ ترکیب اب ذہن میں آئی ہے جب قبر میں پیر لٹک چکے۔ مگر خیر دیر آید درست آید۔“

اجمل : ”یہ تو درست ہے مگر قبلہ آپ سے اور فلم کمپنی سے کیا تعلق۔ آپ کو اس کا کیا تجربہ؟“

قاضی جی : ”بھئی پھر وہی بچوں کی سی بات کی تم نے۔ عزیز من بہت سی صلاحیتیں

انسان میں ایسی ہوا کرتی ہیں جن کا اُس کو علم ہی نہیں ہوتا۔ اگر مجھ کمبخت کو اپنی اس صلاحیت کا پہلے سے علم ہوتا تو آج بھلا میں جوتیاں چٹخارتا پھرتا۔ مگر اس خیال کے ذہن میں آتے ہی میری تو جیسے آنکھیں کھل گئیں۔ اور اب مجھ کو معلوم ہوا کہ میں دراصل تھا ہی اس کام کے لیے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ دو ہی دن میں کتنا بڑا کام میں نے کرلیا ہے۔ کہانی مکمل۔ گانے ختم۔''

اجمل : 'یعنی آپ نے لکھے ہیں گانے اور کہانی وغیرہ۔''

قاضی جی : ''میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ تم کو حیرت ہوگی۔ ارے صاحب مجھ کو خود یقین نہیں آتا کہ میں ایسا قابل ہوسکتا ہوں۔ مگر یہ تو مجھ کو کچھ خدا کا فضل نظر آرہا ہے۔ ہماری کمپنی کے پہلے فلم کا نام ہوگا۔ استغفراللہ۔''

اجمل : ''استغفراللہ؟''

قاضی جی : ''نہیں صاحب یہ تو میں بیگم صاحبہ کے رُخ روشن کو دیکھ کر کہہ رہا ہوں۔ کہ میں تو فلم کمپنی کی باتیں کر رہا ہوں اور وہ اس طرح منہ بنائے ہوئے ہیں گویا میں گھاس کھا گیا ہوں۔ میں چغد ہوں۔ میں پاگل ہوگیا ہوں ارے صاحب اب تک تو خیر میرے متعلق جو کچھ یہ کہتیں وہ ایک حد تک ٹھیک تھا مگر اب تو ان کو بخدا فخر کرنا چاہیے کہ ایسی بے پناہ صلاحیتوں کا مالک گویا ان کا شوہر ہے۔''

بیوی : ''میں تو کہتی ہوں کہ خدا جانے میری قسمت میں لکھا کیا ہے۔ تم روز بروز بہکتے ہی جاتے ہو۔ بھلا بتاؤ یہ باتیں میرے ڈرنے کی ہیں یا نہیں کہ تم نے فلم کے لیے کہانی لکھ لی ہے تم نے گانے لکھ ڈالے ہیں۔ میں تو سچ مچ تمہاری طرف سے بے حد پریشان ہوگئی ہوں کہ خدا جانے میرے مقدر میں کیا لکھا ہے۔''

قاضی جی : ''ملاحظہ فرمایئے آپ کی حماقت؟ خیر تم مجھ کو پاگل ہی سمجھو مگر جس وقت لوگ تم کو میری بیوی سمجھ کر سر آنکھوں پر جگہ دیں گے اُس وقت تم کو اس پاگل اس خبطی اس نا معقول شوہر کی قدر و منزلت کا پتہ چلے گا۔ تو خیر۔ ہاں تو اجمل بھائی ہماری فلم کمپنی کے پہلے فلم کا نام ہوگا۔''
''اتفاق۔''

اجمل : ''اتفاق۔ اتفاق سے آپ کا مطلب اتحاد سے ہے۔''

قاضی جی : ''یہی تو خوبی ہے اِس نام میں کہ یہ مطلب بھی ہے اور وہ مطلب بھی جو تم نہیں سمجھے۔ کہانی میں نے اس طرح شروع کی ہے کہ ایک ربڑ ٹائر ٹانگہ ہے جس پر پردہ بندھا ہوا ہے گویا اس میں زنانی سواریاں ہیں اور تانگہ نہایت تیزی سے ایک سنسان سڑک سے گذر رہا ہے اور تانگے والا گا تا جا رہا ہے

لمبی چوڑی سڑکوں پر...... ہاں پر...... ہاں پر
میرا تانگہ فرفر جائے
مرا تانگہ فرفر جائے
مرا گھوڑا ہنٹر کھائے
دُم لہرائے
چال دکھائے
لمبی چوڑی سڑکوں پر...... ہاں پر...... ہاں پر
میرا تانگہ فرفر جائے۔
پھول سی ہلکی پھلکی سواری میں واری

بیوی۔ ''(ہنس کر) بھئی اللہ۔ بس خدا ہی تم پر رحم کرے۔''

قاضی جی۔ ''لاحول ولا قوۃ۔ اگر اس طرح سنو گی تو میں سُنا چکا۔ سمجھنے کی تمیز ہے نہیں اور بھئی اللہ اور اوئی اللہ شروع کر دیا۔ تم کیا جانو کہ فلم کے گانے اسی طرح ہوتے ہیں۔ یہی گانا جب سازوں کے ساتھ چلتی ہوئی دھن کی شکل میں آئے گا تو دیکھئے گا کہ کیا قیامت ہوتا ہے۔''

اجمل : ''بھابی ذرا سن لینے دیجئے۔ مجھے تو بے حد لطف آ رہا ہے۔ قاضی جی کے یہ کمالات تو آج ہی مجھ پر روشن ہوئے ہیں۔''

قاضی جی : ''ارے صاحب ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے۔ دم بخود رہ جاؤ گے آگے سن کر۔ خیر گانوں کو جانے دو ان کا لطف تو سازوں ہی پر آئے گا مگر کہانی سنو کہ کس قیامت کی ہے۔ تو صاحب وہ تانگے والا اسی طرح گاتا ہوا جا رہا ہے کہ ایک موڑ پر ایک موٹر سے ٹکر ہو جاتی ہے اور تانگے کی سواری نکل کر سڑک پر گر پڑتی ہے۔ قیامت کا حسن ہے۔ موٹر چلانے والا نوجوان اس کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ اور اس کو اسی بے ہوشی کی حالت میں موٹر پر ڈال کر چل دیتا ہے اور اپنی عالی شان کوٹھی میں لے آتا ہے اور تیمار داری کرتا ہے۔ وہاں صاحب ایک واقعہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہوش آ جاتا ہے۔''

بیوی : ''(ہنس کر) لو اور سنو۔ یہ واقعہ ہوا ہے۔''

قاضی جی : ''خیر۔ خیر تم کو تو نکتہ چینی سے مطلب ہے مگر خدا کے لیے کہانی کے لطف کو غارت نہ کرو یہ بڑا پر لطف موقع ہے۔ تو جناب وہ ہوش میں آتے ہی کہتی ہے میں کہاں۔ وہ جواب دیتا ہے۔ آپ یہاں۔ وہ کہتی ہے۔ الٰہی یہ بیداری ہے یا خواب۔ وہ کہتا ہے۔ جو کچھ بھی سمجھیں

جناب۔ وہ کہتی ہے میں تانگے پر جا رہی تھی۔ وہ کہتا ہے۔ میں موٹر پر آ رہا تھا۔ وہ کہتی ہے۔ تانگے والا گا رہا تھا۔ وہ کہتا ہے۔ یہ بھی اتفاق کہ میں سیٹی بجا رہا تھا۔ وہ کہتی ہے۔ پھر تانگہ لڑا۔ وہ کہتا ہے آپ کو بالکل ٹھیک یاد پڑا۔

بیوی : ''تو کیا پوری کہانی سناؤ گے اس وقت۔''

قاضی جی : ''لیجیے یہ ہوئی ہے قدر افزائی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اب تم پر میری قابلیت کا سکہ جمنا شروع ہو گیا ہوگا۔ مگر وہ مثل کہ بھینس کے آگے بین بجائی بھینس نے کہا۔ یعنی بھینس بولی۔ گویا بھینس نے کوئی مہمل سا جواب دیدیا۔ خیر تم سے تو مجھ کو اسی قسم کی توقع تھی۔ مگر ان میاں اجمل سے پوچھو کہ ایمانداری کے ساتھ کہدیں کہ کس قیامت کی روانی ہے۔ اس قدر تالیاں بجیں گی اس مکالمہ پر کہ تم ہی صدقہ اتارو گی مجھ پر سے کہ خدا مجھ کو نظر بد سے بچائے رکھے۔''

اجمل : ''یہ تو ٹھیک ہے قاضی جی مجھ کو نہ تو اس کہانی پر کوئی اعتراض ہے نہ میں گانے کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں مگر فلم کمپنی ان ہی دو چیزوں پر تو ختم نہیں ہو جاتی۔ سوال پھر یہی پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی اور تو یہ کام یا اس سے ملتا جلتا کوئی کام شروع سے کیا ہی نہیں ہے۔''

قاضی جی : ''نہ سہی۔ ارے بھئی نہیں کیا ہے تو نہ سہی۔ اب کریں گے اور دیکھ لینا ایسا کریں گے اس کام کو دنیا منہ دیکھ کر رہ جائے گی۔ اور فرض کر لو کہ نصیب دشمناں شیطان کے کان بہرے۔ نہ چلی یہ کمپنی تو بھی اپنی گرہ سے کیا گیا۔''

بیوی : ''ہاں اور کیا تمہارے لیے تو ایک تماشہ ہوگیا اور جو لوگ اس کام کو کر سکتے تھے۔ ایک تو ان کا حق مارا گیا دوسرے تمہارے اس شوق کے پیچھے اپنے پاکستان کی ایک صنعت یوں غارت ہوئی۔''

قاضی جی : ''لیجیے لے آئیں وہ گھما پھرا کر اپنے پاکستان کو اس ذکر میں بھی۔ کوئی پوچھے ان عقل مند سے کہ بھلا اس میں پاکستان کا کیا ذکر تھا۔ مگر معلوم نہیں یہ پاکستان ان کی زبان پر کیوں اس قدر رچ گیا ہے۔ یہ بات پاکستان وہ بات پاکستان۔ پاکستان نہ ہوا جناب کا تکیہ کلام ہوگیا۔ اور اگر پاکستان کو آپ میرے لیے کوئی دھونس سمجھتی ہیں تو کان کھول کر سن لیجیے کہ میں بھی کوئی انگلستان کا رہنے والا نہیں ہوں۔ پاکستان اگر تمہارا ہے تو میرا بھی ہے۔''

اجمل : ''پاکستان زندہ باد۔ آج تو شکر ہے کہ پاکستان کو آپ نے بھی اپنا لیا۔ اچھا اب جان کی امان پاؤں تو ایک بات عرض کروں۔''

قاضی جی : ''فرمائیے۔ فرمائیے۔ آپ کے لیے تو ضروری ہے کہ اپنی بھاوج کی طرفداری کریں۔ اس فرض سے بھلا آپ غافل ہو سکتے ہیں۔ بہر حال آپ کو جو کچھ فرمانا ہے ارشاد فرمائیے میں سننے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔

وہ......وہ...... ہائے ہائے کتنا لاجواب شعر تھا اس وقت بالکل یاد نہیں آرہا ہے۔''

اجمل : ''قاضی جی بھابی کا اور میرا مطلب یہ ہے کہ یہ فلم کمپنی آپ کے بس کا روگ نہیں ہے۔ آپ کو اگر کچھ کرنا ہی ہے تو ایسا کام کیجیے جس کا آپ کو کچھ تجربہ ہو۔ جس کی کامیابی کا آپ کو یقین ہے۔

بیوی : ''اور کیا۔ کرنا ہی چاہیے وہ کام جس سے خود اپنے کو بھی فائدہ پہنچے اور ملک اور قوم کو بھی فائدہ پہنچنے کی امید ہو۔''

قاضی جی : ''خدا کے لیے کبھی تو مجھ نامراد سے اس طرح باتیں کیا کرو جس سے مجھ کو یقین آئے کہ یہ میری بیوی گفتگو کر رہی ہے۔ میں تو کانپ جاتا ہوں تمہاری زبان سے ملک اور قوم قسم کے الفاظ سن کر۔ ارے صاحب آپ میری اہلیہ ہیں۔ میری رفیقۂ حیات ہیں۔ میری شریکِ غم ہیں۔ مگر اس قسم کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا بیوی کے بجائے یا تو آپ اخبار بن گئی ہیں یا کوئی بہت بڑی لیڈر واقع ہوئی ہیں۔ اور پھر یہ کہ بات جو کرتی ہیں وہ نہایت مہمل۔ جس کام کا مجھ کو تجربہ ہے وہ کیا خاک کر سکتا ہوں۔ تھانیداری کی ہے زندگی بھر اب بتائیے میں تھانیداری کیسے کر سکتا ہوں۔''

بیوی : ''اچھا تو سوال یہ ہے کہ تم ڈاکٹری! کیوں نہیں کرتے۔''

قاضی جی : ''ڈاکٹری (قہقہہ لگا کر) بھئی کیا عقل کی پوٹ بیوی ملی ہے ہم کو بھی۔ یعنی میں ڈاکٹری بھلا کیسے کر سکتا ہوں۔ جس کو یہ تمیز نہ ہو کہ نبض انسان کی گدی میں ہوتی ہے یا بغل میں اس کو جناب ڈاکٹری کا مشورہ دے رہی ہیں۔''

بیوی : ''بس ٹھیک ہے اسی طرح تم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ فلم کس چڑیا کا نام ہے۔ پھر آخر فلم کمپنی کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔''

قاضی جی : ''یہ تو صاحب قایل کرنے کا نہایت ہی بے ہودہ طریقہ ہے۔ کہ مثالیں دے کر قائل کیا جائے۔ مگر تم خود ہی دیکھ لو کہ آخر میں نے کہانی لکھی ہے یا نہیں۔ گانے تیار کیے ہیں یا نہیں۔''

بیوی : ''خدا کے لیے یہ کہانی یا یہ گانے کسی کو سنانا بھی نہیں۔ لوگ مذاق اڑائیں گے۔''

قاضی جی : ''کیا مطلب؟ یعنی اس قدر لغو ہیں اس قدر مہمل ہیں۔ جب تم اپنی حقیقی یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ خاص اپنی بیوی ہوکر ایسی باتیں کہہ رہی ہو تو مجھ کو کسی اور سے کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ وہی سعدی والی بات ہوئی کہ سعدی اپنے ہاتھ......نہ......نہ...... وہ تو فارسی میں ہے کہ سعدی از دست خویشتن فریاد۔ خدا نہ کرے کہ کوئی شخص اپنے گھر ہی میں ذلیل سمجھ لیا جائے۔ میرا کیا ہے لعنت بھیجو فلم کمپنی پر۔ آج سے اگر کسی فائدے کی بات کا ذکر بھی کروں تو تھو ہے میری اوقات پر۔''

(غصہ میں چلے جاتے ہیں)

(۷)

(قاضی جی فکر سخن میں کچھ گنگنا رہے ہیں)

قاضی جی : ''(دیر تک گنگنانے کے بعد) اے وزیرانِ مملکت...... اوں ہنھ وزیران سلطنت......اے وزیران سلطنت......اے وزیران سلطنت آداب۔''

اجمل : ''(داخل ہوتے ہوئے)'' آداب بجالاتا ہوں قاضی جی۔ بھابی تسلیم۔ یہ کیا ہو رہا ہے قبلہ؟ کوئی غزل وغیرہ فرمائی جا رہی ہے۔''

بیوی : ''مہترانی دو دن سے نہیں آئی ہے۔ اسی پر شاید کچھ شاعری ہو رہی ہے۔''

قاضی جی : ''لیجیے اب گویا میں ایسا گیا گزرا ہو گیا کہ مہترانی کے متعلق گویا شاعری کروں گا۔ البتہ دل جلتا ہے ان حالات کو دیکھ کر کہ پاکستان کیا ملا ہے پاؤں کی جوتی سر پر آنا شروع ہو گئی ہے۔ دو ٹکے کی مہترانی اور نخرے تو ملاحظہ فرمائیے کہ بارہ روپیہ ماہوار لیں گی۔ روٹی کے تقاضے فرمائیں گی کوڑا اپنی مرضی کے مطابق صاف کریں گی۔ مہینہ میں آٹھ دس ناغہ بھی فرمائیں گی اور اگر کوئی کچھ کہے گا تو کام چھوڑنے کی دھمکی۔ غرے ڈبے۔ تو گویا اب ان خاکروبنوں کی بھی ناز برداریاں کرنا پڑیں گی۔''

اجمل : ''وہ تو درست ہے۔ مگر اس سے اور شاعری سے کیا تعلق۔''

قاضی جی : ''ارے صاحب اب کہاں کی شاعری۔ شاعری کا تو ایک زمانہ تھا کہ آپ کے سرعزیز کی قسم جس طرح میں طبع آزمائی کردی پھر کسی کا چراغ اپنے سامنے جلنے نہ دیا۔ بڑے بڑے معرکے رہا کرتے تھے۔ اب تو مشق چھوڑے اتنا زمانہ گذر چکا ہے کہ رات سے اپنا تخلص یاد کرتا پھر رہا تھا اور یقین جانیے تخلص تک یاد نہ آتا تھا۔ بمشکل تمام ۱۸۹۱ء کی ایک جنتری کی یادداشت کے خانہ میں تخلص نظر آگیا تو میں نے کہا کہ لاؤ اس کو ذرا کام ہی میں لایا جائے میں ایک عرضداشت بھیج رہا ہوں۔ وزرائے پاکستان کے نام۔''

اجمل : ''عرضداشت؟ وزراء کے نام؟؟ کس سلسلہ میں؟''

بیوی : ''ابھی سن تو چکے ہیں آپ کہ کی مہترانی نہیں آتی۔ اسی سلسلہ میں ہوگی۔''

قاضی جی : ''صرف مہترانی ہی نہیں صاحب میرا تو ارادہ ہے کہ اپنے دل کے تمام بخار نکالوں گا۔ خوب اچھی طرح۔ اسی لیے ذرا دھیان دیکر لکھ رہا ہوں۔ ارادہ یہی ہے کہ شروع میں ایک آدھ چٹپٹا سا شعر ہو۔ اس کے بعد تمام مفصل حالات بیان کروں کہ ہم لوگوں پر کیا گذر رہی ہے۔ کن مشکلات کا سامنا ہے۔ اور ان کو کس طرح حل کیا جا سکتا ہے۔ ذرا دیکھیے گا کیسی زبردست چوٹیں کرتا ہوں۔ میں اس عرضداشت کی ایک ایک نقل تو بھیجوں گا ہر وزیر کو۔ ایک نقل جائے گی وزیر اعظم کو، اور اگر کسی نے سنوائی نہ کی تو اخبارات میں چھپواؤں گا اسی عرضداشت کو۔ دیکھ لیجیے گا آگ لگ جائے گی آگ۔''

بیوی : ''بس یہی ایک ضروری کام باقی رہ گیا ہے تم کو جو لوگ ضروری کاموں میں لگے ہوئے ہیں ان کو کچھ اور نہ کرنے دو اور اپنے جھگڑوں میں جو خود بھی طے کر سکتے ہو پھنسا لو۔''

قاضی جی : ''صاحب یہ علمی باتیں ہیں خدا کے واسطے ان میں دخل نہ دیجیے۔ ہر بات میں بولنا اچھا نہیں ہوتا۔ اس کو دخل در معقولات کہتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ لوگ میری بیوی کو دخل در معقولات کی مریضہ سمجھیں۔ بھلا میں بھی کبھی تمہارے چولھے ہانڈی کے معاملات میں دخل دیتا ہوں۔ کبھی سینے پرونے کی لغویت میں ٹانگ اڑاتا ہوں۔ پھر آخر تم کیوں میرے علمی ادبی بلکہ سیاسی معاملات میں قدم رنجہ فرمایا کرتی ہو۔ فرماتی ہیں کہ ان جھگڑوں کو میں خود طے کر سکتا ہوں۔ چہ خوش۔ گویا رفع شر کے لیے میں جھاڑو دینا شروع کردوں۔''

اجمل : ''قاضی جی بھابی کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے وزراء اور دوسرے ذمہ دار افسر اس وقت بہت ہی ضروری معاملات میں اُلجھے ہوئے ہیں۔''

قاضی جی : ''سبحان اللہ! آپ کی وکالت کے مارے اور ناک میں دم ہے۔ ان کی ہر لغویت کی تائید آپ پر گویا فرض ہے۔ ارے صاحب اس سے زیادہ ضروری معاملہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ ان مہتروں اور مہترانیوں کے بدولت گندگی کے قدم جمتے چلے جارہے ہیں اور ایک مہتروں کا قصہ تھوڑی ہے۔ دھوبی ہیں ان کے دماغ نہیں ملتے، دوکاندار ہیں وہ سیدھے منہ بات نہیں کرتے، تانگے والے ہیں وہ دق کرتے ہیں۔ نہ کہیں کوئی قیمت کسی چیز کی مقرر ہے نہ کسی کا کوئی ریٹ۔ حضت میں

آپ کو کیا بتاؤں کہ کیسا اندھیر مچا رکھا ہے ان لوگوں نے۔ اور بیگم صاحبہ دام اقبالہا فرماتی ہیں کہ میں خود یہ جھگڑے طے کرسکتی ہوں۔ ’’

بیوی : ’’ایسا اندھیر تو خیر ہو ہی نہیں سکتا کہ سرکاری طور پر ان باتوں کی روک تھام ہوتی ہی نہ ہو۔ ’’

قاضی جی : ’’لیجیے اب گویا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ گویا میں کذاب ہوں۔ افتراء پرداز ہوں۔ دغاباز ہوں۔ خیر صاحب۔ ع

تم ہی سچی سہی اس بات کا جھگڑا کیا ہے

مگر واللہ قیامت ہے کہ کبھی بھول کر بھی یہ محترمہ اس بندۂ ناچیز کی طرفداری کا گناہ نہیں کرسکتیں۔ خیر کچھ بھی ہو مگر میں تو اب طے کر چکا ہوں کہ اپنی ایک ایک شکایت ذرا افسران بالا تک تو پہنچادوں پھر دیکھا جائے گا۔ ’’

اجمل : ’’ قاضی جی آپ تو ایک دم سے جلبلا جاتے ہیں۔ میرا اور بھابی کا دونوں کا مقصد یہ ہے کہ آپ ذرا اِس بات کو سمجھ لیں کہ شکایت میں جو ایک غیریت کا پہلو نکلتا ہے اُس کا اب کوئی موقعہ نہیں، جب کہ پاکستان ہی آپ کا ہے۔ ’’

قاضی جی : ’’پھر وہی پاکستان آپ کا ہے۔ اے جناب خدا کے واسطے مجھ کمبخت فاتر العقل۔ حماقتِ مآب اور سولہ آنہ چُغد کو یہ تو سمجھا دیجئے کہ پاکستان اگر ہمارا ہے تو یہ تکالیف کیوں ہیں۔ صرف اسی کہنے پر تو زندگی بسر نہیں ہوسکتی کہ صاحب پاکستان ہمارا ہے۔ مہترانی صفائی نہیں کرتی۔ مگر پاکستان ہمارا ہے۔ دودھ والا سفید رنگ کا پانی پلاتا ہے تو کیا ہوا۔ پاکستان ہمارا ہے۔ دھوبی سالانہ دھلائی لانے لگا اس

لیے کہ کپڑے اُس کے ہیں اور پاکستان ہمارا ہے۔ ’’

بیوی : ’’تالو سے زبان لگاؤ تو کوئی تم سے بات کرے۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ سدھرتے ہی سدھرتے معاملات سدھرینگے۔ جن لوگوں کو تم اپنی یہ چھوٹی چھوٹی شکائتیں پہونچا کر پریشان کرنا چاہتے ہو تم کو کیا معلوم کہ وہ اِس وقت کتنے ضروری اہم اور بڑے بڑے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ ’’

قاضی جی : ’’مجھ کو بھلا کیا معلوم۔ البتہ آپ ہی کے مشورے سے وہ لوگ بڑے بڑے کام کررہے ہیں۔ اور ان کے ہر کام کی رپوٹ گویا آپکے ملاحظہ کے لیے روزانہ باورچی خانہ میں پیش ہوتی رہتی ہے۔ معلوم نہیں یہ یقین جناب کو کیوں کر ہوگیا ہے کہ بڑی سمجھدار اور بڑی معاملہ فہم ہیں گویا آپ۔ خدانہ کرے کہ کسی کو اپنے متعلق غلط فہمی پیدا ہو جائے۔ ’’

اجمل : ’’دیکھئے قاضی جی آپ اِس کو پھر تائید کہیں گے۔ بات بھابی نے بالکل معقول کہی ہے۔ اِس وقت ہمارے تمام وزیر اور تمام ذمہ دار لوگ واقعی اس قسم کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ ’’

قاضی جی : ’’اجی مجھ کو معلوم ہے کس قسم کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر جن کاموں کو آپ معمولی سمجھ رہے ہیں میرے نزدیک وہ معمولی نہیں ہیں۔ میں اِس عقل مندی کا قائل نہیں ہوں کہ دیوار کو اوپر سے نیچے کی طرف تعمیر کیا جائے۔ ارے بھئی دیوار نیچے سے اوپر کی طرف اٹھائی جاتی ہے۔ ذرا غور کیجیے بیگم صاحبہ اور ذرا توجہ فرمایئے اجمل صاحب یہ مثال میں نے معمولی نہیں دی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایک ہے دیوار۔ فرض کر لیجئے پاکستان ہے دیوار۔ ’’

بیوی : ’’توبہ ہے اللہ۔ وہ تو میں سمجھ گئی مگر کیا تم چاہتے ہو کہ یہ ذمہ دار افسر فوجوں کی تقسیم۔ گولہ بارود کے قصے۔ خزانہ اور جائدادوں کے جھگڑے بکھیڑے بلکہ اِن سے بھی بڑے بڑے کاموں کو چھوڑ کر تمہاری اِن گھریلو شکایتوں میں اُلجھ کر رہ جائیں۔‘‘

قاضی جی : ’’پھر وہی گھریلو شکایت۔ ارے صاحب گھریلو شکایت تو جب ہوتی اگر میں وزیر حکومت کو تمہارے متعلق لکھتا کہ صاحب اِس گھر والی نے میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ میری زندگی تلخ کر دی ہے۔ مجھ کو ناکوں چنے چبوا رکھے ہیں خدا کے واسطے اس کو شوہر آزاری کے جرم میں گرفتار کر کے مجھ کو اس مصیبت سے نجات دلوائے تو یہ البتہ گھریلو شکایت ہوتی۔ مگر اس سلسلہ میں تو خاموش ہوں میں۔ اور میرا تمہارا معاملہ تو بس خدا کے سپرد ہے۔‘‘

اجمل : اچھا۔ اچھا۔ یوں ہی سہی قاضی جی۔ اب یہ فرمائیے کہ یہ گھریلو شکایت آپ حکام سے کیوں نہیں کرتے۔ اسی لیے نہ کہ اپنے گھر کے ان نجی جھگڑوں کو باہر لے جاتے ہوئے شرم آتی ہوگی۔‘‘

قاضی جی : ’’بیشک شرم کی بات ہے۔ حضت میں اُس خاندان کا چشم و چراغ ہوں جس کی مستورات کی آواز تک کسی نامحرم کے کان میں کبھی نہ پہونچ سکی۔ خدا بخشے میری ایک دادی تھیں جن کا میں گویا پوتا ہوں۔ یعنی وہ میرے والد مرحوم کی سوتیلی والدہ تھیں۔ استغفر اللہ معلوم نہیں ان کا ذکر کس بات پر آ گیا تھا تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ گھریلو معاملات کو تو ہم خود سلجھا سکتے ہیں۔‘‘

بیوی : ’’تو یہ تمہارے گھریلو معاملات ہیں پاکستان اب تمہارا گھر ہی تو ہے۔‘‘

اجمل : ’’میں عرض کروں قاضی جی۔ دیکھئے شکایت میں جو ایک مغائرت کا پہلو نکلتا ہے اُسکا اب کوئی موقع نہیں ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’کیا مطلب؟ صاحب یہ بڑی مصیبت ہے کہ آپ لوگ یا تو نہایت حماقت آمیز گفتگو کرتے ہیں یا کوئی ایسی بات کہہ دیتے ہیں جو میری سمجھ میں نہ آئے۔ اب معلوم نہیں یہ مغائرت کا پہلو آپ کیا فرما گئے۔ خیر وہ کسی چیز کا پہلو نکلے مگر میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ جس کا دیکھئے دماغ ہی ساتویں آسمان پر ہے۔ وہی لوگ جو پہلے ہاتھ جوڑ جوڑ کر حضور اور سرکار کہا کرتے تھے اب چاہتے ہیں کہ ہم خود ان کو ایک ایک کام کے لیے عرضیاں دیا کریں کہ بحضور فیض گنجور جناب مہترانی صاحبہ دام اقبالہا گذارش یہ ہے کہ فدوی کے مکان میں عرصہ دو یوم سے صفائی کی طرف آنجنابہ نے توجہ نہیں فرمائی ہے۔ جس سے سخت تکلیف ہے۔ کیا خوب۔ جی چاہتا ہے کہ مارے ہنٹروں کے دماغ درست کر دیا جائے۔‘‘

بیوی : ’’بس تمہارے پاس تو ہر بات کا علاج یا تو ہنٹر ہے یا پھر یہ کہ کوئی بہت دور کی ناممکن سی بات سوچ کر اُس میں الجھ جاتے ہو۔‘‘

قاضی جی : ’’تو پھر اور کیا کروں؟ اب جناب ہی کوئی مشورہ دیں۔ البتہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ قلم کاغذ چھوڑ کر آپ کی مرضی کے مطابق جھاڑو پنجہ سنبھال لوں۔ حالانکہ اگر تمہارا بس چلے تو تم یہ بھی گت بنا دو میری۔ تم سے تو مجھ کو ہر امید ہے۔ وہ تو کہیے کہ خدا کے فضل سے اب تک ہاتھ پیر چل رہے ہیں۔ کسی کا دست نگر یا محتاج نہیں ہوں ورنہ تمہاری قلمرو

میں میرے لیے جو کچھ بھی ہو تھوڑا ہے۔"

بیوی : "بے بات کی بات پر بگڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ ذرا باہر نکل کر پوچھ گچھ کرتے کہ آخر اس کمبخت مہترانی کو کیا ہو گیا ہے محلہ میں اور مہتر بھی تو ہوں گے نکالو اس کمبخت کو کسی اور کا انتظام کر لو۔"

قاضی جی : "مجھ سے تو اس قسم کی ٹچی باتیں محلہ والوں سے کہی نہ جائیں گی کہ صاحب ہمارے یہاں مہترانی نہیں آئی اس سے ہماری صلح صفائی کرا دیجئے یا کسی اور مہتر کا انتظام کر دیجیے۔"

اجمل : "محلہ والوں سے یہ بات آپ کہتے ہوئے شرما رہے ہیں اور وزراء کو یہ شکائتیں لکھ رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔"

بیوی : "مطلب تو یہ ہے کہ نہ خود کچھ کریں گے نہ کام کرنے والوں کو کچھ کرنے دیں گے۔"

قاضی جی : "یہ...... یہ...... مطلب یہ ہوا کہ گویا مجھ سے زیادہ بیکار انسان اس دنیا کے پردے پر اور کوئی ہے ہی نہیں۔ حالانکہ آج میرا قلم اُٹھ گیا تھا۔ جو چیزیں تیار کر کے افسران بالا کو بھیجنے والا تھا۔ وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک آگ لگا دیتیں۔ ایک قیامت برپا کر دیتیں۔ اخبارات میں ہلچل مچ جاتی۔ مگر اس کی قدر ہمارے گھر۔ میں یہ ہے کہ گویا یہ سب لغویت ہے تو میری بلا سے نہ آئے مہترانی۔ پڑا بھنکتا رہے یہ گھر آج سے اگر میں گھر کے کسی معاملہ میں دخل دوں جب ہی کہنا۔ جو تم سب کا جی چاہے وہ کرو۔"

اجمل : "ٹھہریے تو قاضی جی۔ سنئے تو قاضی جی۔ میں مہترانی کا انتظام کیے دیتا ہوں۔"

قاضی جی : "میری بلا سے۔ میں باز آیا۔ بھر پایا میں نے۔ آج سے اگر گھر کے کسی معاملہ میں بولوں تو قاضی نہیں کچھ اور کہنا۔ لعنت ہے مجھ پر جو میں اب دخل دوں کسی معاملہ میں۔ میری طرف سے جہنم میں جائے یہ گھر بھی اور یہ...... یہ...... یہ گویا گھر کے سب لوگ بھی۔ ع

ہم نے چاہا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد

سو۔ سو وہ بھی لاحول ولا قوۃ۔ استغفر اللہ۔

(۸)

(قاضی جی گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوتے ہیں)

قاضی جی : ’’میں نے کہا سنتی ہو۔ ارے بھئی کدھر گئیں۔‘‘

بیوی : ’’(دور سے) ادھر ہوں باورچی خانہ میں۔‘‘

قاضی جی : ’’ٹھیک ہے ٹھیک ہے میں وہیں آتا ہوں (قریب پہونچ کر) میں نے کہا ایسے میں فجو آیا ہوا ہے۔ ہر چیز ذرا ڈھنگ سے تیار کر لے گا۔ میں رات کے کھانے پر اجمل۔ اکرام اور محسن وغیرہ کو بلا آیا ہوں۔‘‘

بیوی : ’’تو اس کے لیے فجو کی کیا ضرورت ہے۔ فجو نہ ہو تو کھانا ہی نہ پکے؟‘‘

قاضی جی : ’’وہ تو ٹھیک ہے مگر مرغ اور بریانی کا وہ استاد ہے اور شاہی ٹکڑے تو تم خود کہتی ہو کہ ایسے تیار کرتا ہے کہ جواب نہیں اس کا۔‘‘

بیوی : ’’مگر آج کل یہ چیزیں؟‘‘

قاضی جی : ’’کیا مطلب؟ ارے بھئی آج کل سے کیا مطلب۔ کیا اس موسم میں کھانا کچھ اور ہونا چاہیے۔ جاڑے کی مناسبت سے؟ آپ کا مطلب یہ ہوگا کہ میں کچھ چسٹر، لحاف اور کمبل وغیرہ پکواؤں۔ یہ آخر جناب نے آج کل کے متعلق کیا گہرافشانی فرمائی ہے۔ بعض وقت تو عجیب عقلمندی کی بات کہہ جاتی ہو۔ ارے بھئی بریانی کوئی ترکاری تو ہے

نہیں جس کی یہ فصل نہ ہو نہ جاڑے میں مرغ سے شربت کی طرح پرہیز ہوتا ہے۔‘‘

بیوی : ’’توبہ ہے۔ نہ سمجھو نہ بوجھو۔ بس بکے جا رہے ہیں۔ میرا مطلب آج کل سے یہ تھا کہ یہ وقت بھی بھلا ان پرتکلف دعوتوں کا ہے۔ اس وقت تو سب سے بڑی دعوت یہی ہے کہ پیٹ بھر روٹی جڑ جائے۔‘‘

قاضی جی : ’’بھئی لاحول ولاقوۃ۔ ہزار مرتبہ تم سے کہا کہ ہر وقت کی یہ تمہاری لیڈری مجھ کو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ اب تک تو خیر جناب کو یہی شوق تھا کہ میری ناک میں دم کیا جائے۔ اب ایک سرے سے ناک غائب ہی کرنے کی فکر ہوگئی۔ یعنی میں اُن لوگوں کو مدعو کر آیا ہوں اور یہاں وقت کی نزاکت پر بیوی صاحب تقریر کرنے والی ہیں۔ مجھ کو معلوم ہے کہ ہر چیز مہنگی ہے میں اندھا نہیں ہوں۔ دیکھ رہا ہوں کہ چینی تک عنقا ہے۔ مگر دُنیا کے کارخانے آخر چل ہی رہے ہیں۔ کیا تمہارا مطلب یہ کہ میں دعوت میں بلا کر مہمانوں کے سامنے بجائے کھانا رکھنے کے تم کو کھڑا کر دوں گا۔ کہ ذرا بیگم وقت کی نزاکت پر ایک تقریر تو کر ڈالو ان کمبختوں کے سامنے۔‘‘

بیوی : ’’نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ یہ وقت ان تکلفات کا نہیں۔ جو گھر میں تیار ہوتا ہے اُسی میں ایک آدھ چیز کہو گے تو بڑھا دوں گی۔‘‘

قاضی جی : ’’بیشک بیشک۔ وہ مر بھکے تو ہیں ہی۔ اُن کے گھر میں کھانا نہیں پکتا لہٰذا وہ یہاں آ کر کھا لیں گے۔ میں کہتا ہوں کیا واقعی تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو تقریباً ہر مہینے اسی گھر میں ایک دعوت تمہارے ہی انتظام میں ہو جایا کرتی تھی۔ دھوم تھی ہمارے

یہاں کی دعوتوں کی تمام شہر میں۔ پچاسوں قسم کے کھانے تم خود تیار کرایا کرتی تھیں۔ مگر معلوم نہیں تم کو کسی کی نظر کھا گئی۔

بیوی : ''ان ہی تمام فضول خرچیوں کا نتیجہ تو بھگت رہی ہوں۔ جو کمایا تھا تم نے اُس سے دوگنا اُڑایا۔ نہ کبھی تمہارا دل قابو میں رہا نہ زبان۔ تمہارے پاس تو قارون کا خزانہ بھی ہوتا تو دو دن میں چاٹ کر بیٹھ رہتے۔''

قاضی جی : ''اجی تو گولی مار دو مجھ مردود کو۔ مگر خدا کے واسطے ہم چشموں میں تو ذلیل نہ کراؤ۔ اب جو میں ان نامرادوں کو مدعو کر آیا ہوں اس کا کیا ہوگا۔''

بیوی : ''غصہ نہ کرو تو میں سمجھا دوں تم کو۔''

قاضی جی : ''سمجھایئے صاحب فرمایئے۔''

بیوی : ''حالانکہ اس وقت یہ بھی فضول خرچی ہے مگر تم دعوت کے لیے کہہ چکے ہو تو قورمہ۔ شامی کباب اور ایک کوئی میٹھی چیز۔''

قاضی جی : ''اس دعوت سے قبل خدا مجھ کو موت ہی دیدے۔ زندگی بھر کی نیک نامی اور شہرت محض جناب کی اس بے محل لیڈری کی بدولت خطرے میں پڑی ہوئی ہے۔ یہ دعوت کا کھانا ہوا یا اسٹیشن کے ریفرشمنٹ روم کا راتب۔ خدا کے لیے اس موقع پر مجھ نامراد کو بخش دو آئندہ اگر میں کسی کی دعوت کروں تو جو چور کی سزا وہ میری۔''

بیوی : ''میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ آخر میں تم کو کس طرح سمجھاؤں۔ تمام دنیا میں تو آئی ہوئی ہے ایک قیامت ایک ایک سوکھی روٹی کے لیے مصیبت زدہ ترس ترس کر مر رہے ہیں اور......''

قاضی جی : ''اب میں اپنا سر پیٹ لوں گا جو تم نے یہ لیکچر دینا شروع کیا۔ یہاں عزت آبرو کا سوال ہے۔ خدا جانے کیا شامت آئی تھی کہ ان کے بھروسے پر احباب کی دعوت کر بیٹھے۔ اپنی بیوی پر دُنیا میں بھروسہ ہوتا ہی ہے مگر ہماری بیوی تو اس تاک میں رہتی ہیں کہ موقع ملے اور ماریں شوہر کو ایسی جگہ جہاں پانی نہ ملے کمبخت کو۔ خدا جانے میرے کن اعمال کا عذاب ہے جو بیوی کی حیثیت سے میرے سر پر نازل ہوا ہے۔''

بیوی : ''خدا کے لیے یہ قیامت تو اٹھاؤ نہیں۔ تم سمجھ چکے اور میں سمجھا چکی۔ آخر معلوم تو ہو کہ تم کیا انتظام چاہتے ہو۔''

قاضی جی : ''اپنا سر چاہتا ہوں۔ دل جلا کر خاک کر دیا اب پوچھتی ہیں میں کیا چاہتا ہوں۔ میں کوئی اتنا بیوقوف تو ہوں نہیں کہ یہ بھی نہ سمجھوں کہ یہ وقت اُن تکلفات کا نہیں ہے جو دعوتوں میں عموماً میرے یہاں ہوا کرتے تھے۔ پھر بھی میں چاہتا کہ بریانی ہو جاتی۔ مرغ۔ نرگسی کوفتے۔ محسن کو تمہارے ہاتھ کی مچھلی بہت پسند ہے لہٰذا مچھلی۔ شامی کباب اور میٹھی چیزوں میں شاہی ٹکڑے اور شیر برنج۔ اللہ اللہ خیر صلاّ۔ بھلا یہ کون سے دو ہزار کھانے ہو گئے؟''

بیوی : ''اب تم ہی ٹھنڈے دل سے غور کر کے بتاؤ کہ یہ اسراف ہیں یا نہیں اور یہ وقت اسی قسم کی فضول خرچیوں کا ہے۔''

قاضی جی : ''کمال کرتی ہو قسم خدا کی یعنی چند کھانے تجویز کئے ہیں۔ اس قسم کی ذلیل دعوت آج تک میں نے تو کی نہیں تھی۔ مگر کیا کروں وقت کی بات ہے تو گویا یہ بھی اسراف ہے۔ کیا میں معلوم کر سکتا ہوں کہ جناب

اس میں کیا کفایت شعاری کے جوہر دکھا سکتی ہیں۔‘‘

بیوی : ’’کفایت شعاری؟ بس رہنے بھی دو۔ کفایت شعاری بیچاری کے تو قدم بھی اس گھر میں نہیں آسکتے۔ ہو چکی تم سے کفایت شعاری۔ کفایت شعار ہی ہوتے تو یہ دن دیکھنا کیوں نصیب ہوتا۔‘‘

قاضی جی : ’’لیجیے اب وہاں اس بڈھے طوطے کی تعلیم شروع ہوگئی۔ اب گویا میں قبر میں پیر لٹکا کر اس سعادت مندی کا ثبوت دوں گا کہ جناب بیوی صاحبہ مدظلہا مجھ کو کفایت شعاری کا سبق پڑھائیں گی اور میں بیٹھ کر یاد کرونگا اس سبق کو۔ رہ گئے وہ دوست جو شام کو کھانے پر آنے والے ہیں وہ گئے گویا جہنم میں۔‘‘

بیوی : ’’میری سمجھ میں تو وہ دوست ہی نہیں آتے جو اس زمانہ میں ایسی دعوتیں منظور کر لیتے ہیں۔ فرض کرلو کہ تم سے ایک غلطی ہو بھی گئی تھی تو وہ کیسے تھے کہ اُن کو بھی دعوت منظور کرتے شرم نہ آئی۔‘‘

قاضی جی : ’’یہ۔ یہ۔ یہ ہے تمہارا وہ طریقہ جس سے میں تلملا اٹھتا ہوں۔ تمہاری اس گفتگو کا صاف مطلب یہ ہوا کہ گویا میں تو ہوں ہی ایسا نامعقول کہ مجھ سے ہر لغویت۔ ہر مہملیت اور ہر۔ ہر۔ ہر۔ گویا ہر بےہودہ بات کی امید ہے۔ مگر میرے دوست جو ہر طرح عاقل بالغ ہیں ایسی غلطی کیوں کر گذرے۔ گویا غلطیوں کا ٹھیکہ دار تو صرف میں ہوسکتا ہوں وہ نہیں۔ حماقت صرف مجھ سے سرزد ہوسکتی ہے اُن سے نہیں۔ شرم و حیا کو صرف میں نے بیچ کھایا ہے انھوں نے نہیں۔‘‘

بیوی : ’’جو منہ میں آئے بکتے چلے جاؤ۔ تمہارا تو عجیب طریقہ ہے کہ ایک تو بات نہیں سمجھتے دوسرے بحث کرتے ہو۔ میرا مطلب تو یہ تھا کہ یہ

وقت ان دلچسپیوں کا ہے نہ ان فضول خرچیوں کا۔ ہائے کل میں ریڈیو کا پروگرام سن رہی تھی کہ کس طرح مہاجرین کے چھوٹے چھوٹے بچے اس سردی میں بغیر اوڑھنے بچھونے کے ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر رہے ہیں۔‘‘

قاضی جی : ’’وہ تو ٹھیک ہے۔ ارے بھئی کیا میں نہیں جانتا کہ یہ دُنیا کیسی سرائے فانی بنتی چلی جارہی ہے روز بروز۔ آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ بغیر اوڑھنے بچھونے کے لوگ مر رہے ہیں اور میں یہ کہتا ہوں کہ زندگی کا جو رہا سہا اعتبار تھا وہ بھی اس زمانہ میں اُٹھ گیا ہے۔ اسی لیے تو میں نے کہا جو دم ہے اُسے غنیمت سمجھو۔ یہ دعوت کوئی خواہ مخواہ تھوڑی کر بیٹھا ہوں۔‘‘

بیوی : ’’میں نے تو سچ مچ یہ طے کرلیا ہے کہ چاہے کوئی چیز علیحدہ ہی کرنا پڑے مگر کچھ لحاف بنا کر اور کچھ کمبل خرید کر میں ضرور تقسیم کروں گی۔‘‘

قاضی جی : ’’استغفر اللہ۔ اس میں کسی چیز کے علیحدہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ تو گویا مجھ کو بدنام کرنا ہی ہوا کہ بیوی اپنی مرضی سے کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ حالانکہ میں نے تمہارا کبھی ہاتھ نہیں پکڑا کہ بھئی یہ نہ کرو یہ کرو یعنی تم گھر کی مالک ہو جو چاہو کرو۔ میں ان معاملات میں اپنے باپ کا بیٹا ہوں۔ تمہاری قسم لاکھوں کمایا والد صاحب قبلہ نے مگر جب انتقال فرمایا ہے تو ماموں صاحب نے تجہیز و تکفین کا انتظام کیا تھا اور بعد میں حساب جو لگایا تو چار لاکھ کے مقروض ہو کر مرے تھے۔ یہ تھی وضعداری۔‘‘

بیوی : ’’ہاں مگر میں ایسی وضعداری نہیں چاہتی نا۔ تمہارا اصول تو مجھ کو معلوم ہے کہ کوڑی نہ رکھ کفن کو۔ اور میں چاہتی ہوں کہ چادر کے باہر پیر نہ

پھیلائے جائیں۔ ’’

قاضی جی : ‘‘کیا مطلب یعنی تم تو جلدی سے ایک محاورہ بول گئیں اور میرے کچھ پلے پڑا نہیں۔ اگر یہ جناب نے کچھ دعوت کے متعلق جملہ فرمایا ہے تو اس سلسلہ میں، میں اب مجبور ہوں۔ احباب سے کہہ چکا ہوں، اپنی وضعداری سے مجبور ہوں۔ یا تو میں کوئی کام نہیں کرتا اور اگر کرتا ہوں تو ایسا کہ میرے بزرگ قبروں میں شرمندہ نہ ہوں۔ لہٰذا جناب نے جو کھانا تجویز کیا ہے وہ تو میں دعوت کے نام سے قیامت تک احباب کو نہیں کھلا سکتا۔ ’’

بیوی : ‘‘(زور سے) اور جس قسم کے تکلفات کو تم کہہ رہے وہ اس مصیبت کے وقت مجھ سے تو ممکن نہیں ہے۔ ’’

قاضی جی : ‘‘ایں؟ کمال ہے صاحب یعنی یہ زندگی میں پہلا اتفاق ہے کہ مجھ سے میری بیوی نے اس قسم کی سرکشی کی بات کی ہو۔ مجھ کو تو خود تم سے بھی یہ امید نہ تھی۔ دراصل یہ بھی میری ہی بداقبالی ہے کہ مجھ پر یہ نامراد وقت آپڑا ہے۔ میرے ستارے اس گردش میں ہیں کہ اب گویا ہماری بلی ہم ہی سے میاؤں کہتی ہے۔ اگر آج میرے دن خراب نہ ہوتے تو تم کیوں اس قسم کی بات کرتیں۔ دنیا میں کوئی بیوی اپنے شوہر کو خواہ وہ کیسا ہی تھرڈ کلاس ہو اس قسم کی بات نہیں کہہ سکتی۔ ’’

بیوی : ‘‘اے ہے۔ تو میں نے کون سی ایسی بات کہہ دی جو تم کو اتنی بُری لگ گئی۔ آخر انسان ہوں اگر کوئی ایسی بات کہہ گئی ہوں تو معاف کر دو۔ ’’

قاضی جی : ‘‘اجی بس رہنے دو۔ یہ تمہارا قصور نہیں یہ میری قسمت کی خطا ہے۔ جانتی ہو کہ اب میری حکومت ہی کون سی ہے۔ پنشن لیے پڑا ہوں۔ نہ وہ رعب ہے نہ دبدبہ۔ وہی میں ہوں کہ میری ایک آواز پر خدا جانتا ہے بڑے بڑے کانسٹیبل تک کانپ جایا کرتے تھے۔ اٹینشن ہو کر جب بہت ہی سلیوٹ ہوتے تھے تو میں بھی وقار کے ساتھ ذرا گردن ہلا دیتا تھا۔ اور آج وہی میں ہوں کہ خود اپنی بیوی۔ جن کا مجھ کو والی وارث۔ سرتاج اور مجازی خدا تک ہونا چاہیے تھا ایک کتے کی طرح دھتکار دیتی ہیں اور نہ زمین پھٹتی ہے کہ میں سما جاؤں نہ آسمان کھینچتا ہے کہ اُڑ جاؤں۔ واہ ری قسمت۔ ’’

بیوی : ‘‘توبہ ہے اللہ۔ ایک تو طبیعت یوں ہی پریشان ہے مہاجرین کے حالات سن سن کر۔ اوپر سے تم یہ باتیں کر رہے ہو۔ ’’

قاضی جی : ‘‘جی اور کیا۔ ہم سے اچھے تو مہاجر ہی ہوئے کہ ان کے لیے آپ پریشان تو ہو سکتی ہیں مگر مجھ کو تو یہ درجہ بھی حاصل نہیں۔ آپ کو میرے مقابلہ میں مہاجرین سے کیا معنی ہر ایک سے ہمدردی ہو سکتی ہے۔ وہ تو ایک قصوروار میں ہوں کہ میرے لیے آپ کے دل میں نہ کوئی جگہ کبھی ہوئی ہے نہ اب ہو سکتی ہے۔ بھلا غضب خدا کا! شوہر کی عزت آبرو کا معاملہ درپیش ہے، شوہر کی ناک خطرے میں پڑی ہوئی ہے وہ نامراد، ناہنجار۔ نا۔ نا۔ نامعقول کچھ دوستوں کو مدعو کر آیا ہے اپنے گھر پر کچھ اپنا حق سمجھ کر اور گھر والی ہیں کہ۔ بس خدا ہی دیکھ رہا ہو گا تم کو۔ ’’

بیوی : ‘‘اے تو گھر والی میں تمہارے ہی دم سے تو ہوں۔ تمہاری اگر یہی مرضی ہے کہ دنیا میں جو مصیبت آئی ہوئی ہے اُس سے اس گھر کو الگ سمجھا جائے تو میرا کیا ہے۔ ایک نہیں پچاس دعوتیں کرو۔ اللہ مبارک کرے تم کو۔ مہاجر سردی کھا کھا کر مریں اور تمہارے یہاں دیگیں

کھنکیں۔''

قاضی جی : ''اجی جہنم میں گئی دعوت اور بھاڑ میں گیا یہ گھر۔ دیگیں تو یہاں میرے چالیسویں کی اب کھنکیں گی۔ اب تو دعوت کر ہی بیٹھا ہوں۔ لہٰذا ہوٹل سے انتظام کرلوں گا۔ بازار سے کھانا منگا لینا منظور ہے مگر تمہاری خوشامد قیامت تک نہ کروں گا۔ مجھ کو تم سے یہ امید ہی نہ رکھنا تھی۔ تمہارا تو اگر بس چلے تو مجھ شوہر کو کالا منہ کر کے گدھے پر بٹھاؤ اور گلے میں تختی ٹانگ دو کہ یہ ہے وہ نامراد جس نے میرا شوہر بننے کی گستاخی کی تھی۔ تھو ہے میری اس زندگی پر۔ اور لعنت ہے اس بے حیائی پر کہ موت تک نہیں پوچھتی مجھ کو۔''

(چلے جاتے ہیں)

(۹)

(قاضی جی گھبرائے ہوئے داخل ہوتے ہیں)

قاضی جی : ''اجی میں نے کہا سنتی ہو۔ لاحول ولا قوۃ کبھی جو کام کے وقت نظر آ جاؤ۔ ارے صاحب یہ آخر کہاں؟''

بیوی : ''آ رہی ہوں۔ آ رہی ہوں۔ آتے ہی آتے تو آؤں گی۔''

قاضی جی : ''لیجیے یہ آپ کے برادر عزیز میاں مشتاق کا والا نامہ صادر ہوا ہے۔ شادی فرما رہے ہیں صاحبزادے۔''

بیوی : ''شادی؟ سچ کہو۔ دیکھوں ذرا خط۔''

قاضی جی : ''آپ خط دیکھیے اور میں آس پاس کوئی کنواں ڈھونڈنے جا رہا ہوں ڈوب مرنے کے لیے۔''

بیوی : ''خدا کے لیے اس مبارک وقت یہ بُری فال تو زبان سے نہ نکالو۔ خدا خدا کر کے تو اس کو شادی کی فکر ہوئی نہیں تو شادی کے نام سے ہمیشہ رسیاں تڑاتا تھا۔ اور اب چلے ہو تم ایسی باتیں کرنے۔''

قاضی جی : ''ہاں۔ ہاں۔ تو تم خوشیاں مناؤ۔ شادیانے بجواؤ۔ نوبت رکھو۔ گاؤ بجاؤ ناچو کودو جو جی میں آئے وہ کرو مگر میں نہ اس شادی میں شریک ہو سکتا ہوں نہ میاں مشتاق سے اب میرا کوئی تعلق۔ بھلا غضب خدا کا! جس خاندان کی شرافت کی قسم کھائی جاتی ہو۔ جس خاندان میں جانور

تک صحیح النسب پالے جاتے ہوں جس خاندان کی لڑکیاں بوڑھی ہو ہو کر کنواری مر گئیں مگر کسی ایسی جگہ نہ دی گئیں۔ جہاں حسب نسب میں ذرا بھی شک ہوا۔ یہ حضرت اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔''

بیوی : ''تو آخر وہ کہاں کر رہا ہے شادی کچھ بتاؤ گے بھی یا یوں ہی صلواتیں سناتے رہو گے۔''

قاضی جی : ''شادی کر رہے ہیں جناب ایک ایسی لڑکی سے نہ جس کے باپ دادا کا کوئی پتہ ہے نہ گھر در کی کوئی خبر۔ نہ یہ معلوم کہ کس گھرانے کی ہے نہ یہ خبر ہے کہ ذات پات کیا ہے۔ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں اپنے خط میں:۔

''اُمید ہے کہ کالے خان سے آپ ضرور ملے ہوں گے۔ میں نے اُن کے ہاتھ ہمشیرہ صاحبہ کو جو اُون بھیجا تھا اُس سے بہتر مجھ کو یہاں نہ مل سکا۔ احوال یہ ہے کہ آپ کی بھینس نے دودھ دینا کم کر دیا ہے۔''

''اون؟ لاحول ولاقوۃ یہ تو عبدالوحید کا خط ہے۔ ہاں یہ رہا۔ سنئے فرماتے ہیں:۔

''میں نے لڑکی کا انتخاب مہاجرین کے کیمپ میں کیا ہے۔ یہ ایک ستم رسیدہ اپنے عزیزوں سے بچھڑی ہوئی ایسی لڑکی ہے جس کو حملہ کے وقت دشمن اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اور اب وہ کسی نہ کسی طرح بچ کر نکل آئی ہے۔ میرے نزدیک اس قسم کی لڑکیوں کو اپنانا ہمارا فرض ہے اور میں اس فرض کو پورا کر رہا ہوں۔''

بیوی : ''شاباش۔''

قاضی جی : ''کیا مطلب؟ یعنی گویا جناب بھی اس بات کی تائید میں ہیں کہ یہ لڑکی مناسب ہے۔ یعنی اس کے ساتھ ان حضرت کا شادی کرنا گویا

درست ہے اور یہ کوئی ناک کٹنے کی آپ کے نزدیک بات ہی نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی سوائے اس کے کہ وہ شریک نہ ہو۔''

بیوی : ''میرے نزدیک تو مشتاق وہی کر رہا ہے جو اس موقعہ پر ہر نوجوان کو کرنا چاہیے۔''

قاضی جی : ''یعنی ہر نوجوان کو یہ کرنا چاہیے کہ خاندان کی عزت آبرو پر پانی پھیر دے۔ ہر نوجوان کو یہ چاہیے کہ باپ دادا کی عزت خاک میں ملا دے۔ ہر نوجوان کو چاہیے کہ وہ ایسی لڑکیوں سے شادی کر لے جن کا نہ کوئی ٹھیک ٹھور ہو نہ یہ معلوم ہو کہ صاحبزادی کے ولدیت کے خانے میں آخر کیا لکھا جائے۔ اوپر سے آپ فرماتی ہیں بڑی شان سے شاباش۔ مگر کان کھول کر سن لیجیے جناب بیوی صاحب قبلہ کہ میں ایسا گیا گذرا نہیں ہوں کہ ایک اس قسم کی مہاجر لڑکی کے شوہر کا مجھ کو دولہا بھائی کہا جائے۔''

بیوی : ''تو آخر اس لڑکی میں عیب کیا ہوا۔ جو عیب تم سمجھ رہے ہو اس کو میں سمجھ رہی ہوں۔''

قاضی جی : ''سمجھ رہی ہوں مگر تمہاری ضد میں تسلیم نہیں کروں گی۔ بھائی کی اولاد کی ذات میں بٹہ لگ جائے تو کوئی بات نہیں مگر شوہر کمبخت سے جو ضد باندھ رکھی ہے وہ پوری ہو جائے۔ واللہ ہے کہ ضدم ضدا کی یہ انتہا ہے۔ غضب خدا کا خاندان کی ناک تک اس شوق پر یہ عورت قربان کئے ہوئے ہے کہ شوہر آزاری کا فرض ادا ہوتا رہے۔''

بیوی : ''توبہ ہے اللہ۔ کسی وقت تو ڈھنگ سے بات سن لیا کرو۔ کسی اور کو بھی

تو بولنے کا موقع دیا کرو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ان بیچاری لڑکیوں کو جو اس مصیبت کی شکار ہوئی ہیں آخر کون سمیٹے گا۔"

قاضی جی : "واہ ری تیری شان۔ یہ اُن قاضی عبدالستار کی بہو کے الفاظ ہیں جن کا ہمیشہ یہ قول رہا کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگ سکتا۔ ارے بھئی تم کو تو یاد ہوگا کہ خود میری نسبت راجہ صاحب اشرف آباد کی چھوٹی لڑکی سے ٹھہر چکی تھی۔ پھر آخر شادی نہیں ہوئی۔"

بیوی : "وہ تو اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ راجہ صاحب سے کسی نے کہہ دیا تھا کہ لڑکے کے دماغ میں خلل ہے، بس اُنھوں نے انکار کر دیا۔"

قاضی جی : "خیر۔ خیر۔ یہ تو بہانہ تھا ورنہ ایسا دماغ چراغ لے کر ڈھونڈتے تو بھی ان حضرت کو مشکل ہی سے ملتا۔ اصل قصہ یہ تھا کہ صاحبزادی کی والدہ کے نانا سنا ہے کہ سائیس تھے۔ والد صاحب نے جب یہ سنا تو منہ پیٹ لیا اور صاف کہہ دیا کہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگ سکتا۔"

بیوی : "کہیں بھی نہیں۔ نہ سائیس تھے نہ کوچوان۔ ان کے یہاں گھوڑوں کی تجارت ہوتی تھی۔

قاضی جی : "لیجیے اب شوہر کے مقابلہ میں اس شخص کی طرفداری ہو رہی ہے جس کی ہڈیاں تک قبر میں سرمہ ہو چکی ہوں گی۔ میں کہہ رہا ہوں سائیس تھے اور آپ فرماتی ہیں گھوڑوں کے تاجر تھے۔ فرض کر لیجیے کہ گھوڑوں کے تاجر ہی سہی تو بھی یہ کون سی معقول قسم کی ذات ہوئی۔ کہاں میں نجیب الطرفین قاضی کہاں وہ صاحبزادی جن کے شجرے میں اصطبل تک کو دخل ہو۔ خیر مجھ کو تو مارو گولی۔ تم کو نازو آپا کا قصہ تو یاد ہوگا کہ آئی

ہوئی برات واپس کر دی تھی والد صاحب نے۔"

بیوی : "اے توبہ کرو۔ خدا کے غضب سے ڈرو۔ نازو آپا بے چاری کی نہ تو کوئی برات واپس گئی اور نہ کوئی برات واپس آئی۔ وہ تو شادی کے جھگڑے سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھیں۔"

قاضی جی : "ہاں۔ ہاں۔ ٹھیک ہے۔ یاد آ گیا۔ یاد آ گیا۔ اُن کے انتقالِ پُر ملال کے موقعہ پر تو میں نے یہ کہا تھا کہ ع

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔"

مگر یہ کس کی بارات کی واپسی کا قصہ ذہن میں رہ گیا ہے۔ بہر حال اتنا مجھ کو یاد ہے کہ بڑی دھوم دھام سے جناب برات آئی تھی۔ آگے آگے نہایت اعلیٰ درجہ کی آتش بازی چھوڑتی ہوئی۔ سات قسم کے باجے۔ اتنی موٹر اور خدا جانے کیا کیا طومار تھا۔ مگر جب دولہا میاں محفل میں آئے تو۔ تو۔ خیر چھوڑو اس قصہ کو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ۔"

بیوی : "یہ کس بات کا قصہ لے بیٹھے تھے۔ اور پھر ادھورا چھوڑ دیا۔"

قاضی جی : "نہیں وہ مجھے یاد آ گیا کہ اِس برات میں کوئی عزت آبرو کی بات نہ تھی بلکہ وہ دولہا نہایت ضعیف العمر تھا۔ اور یہ ہمارے خاندان کا قصہ بھی نہیں ہے بلکہ ایک دوست کے یہاں کا واقعہ تھا۔ جن کے والد نے برات واپس کر دی تھی۔"

بیوی : "اللہ خیر کرے۔ اب حواسوں کا بھی یہ حال ہوتا جا رہا ہے۔"

قاضی جی : "صاحب آپ کو کیا معلوم کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہے جب سے آپ کے بھائی صاحب کا یہ خط دیکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ دولت تھی

ہمارے خاندان میں وہ نہیں رہی، حکومت تھی وہ ختم ہوئی۔ جائداد کا یہ حال ہے کہ اس کا ہونا نہ ہونا سب برابر ہے۔ لے دے کے ایک عزت رہ گئی تھی وہ بھی اب تشریف لے جاتی نظر آ رہی ہے۔ تمہارا کیا ہے تم تو گھر کی بیٹھنے والی ٹھہریں مگر مجھ نامراد پر تو اب ہر طرف انگلیاں اُٹھیں گی کہ یہی ہیں وہ حضرت جن کے برادر نسبتی نے ایک ایسی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔‘‘

بیوی : ’’پھر وہی بات ایسی لڑکی۔ خدا کے لیے اُس لڑکی کا قصور تو سمجھا دو۔ میرے خیال میں تو اِس سے زیادہ عزت والی کوئی اور لڑکی ہو ہی نہیں سکتی۔‘‘

قاضی جی : ’’بھئی خدا کے واسطے مجھ کو اس طرح نہ جلایا کرو۔ عزت والی لڑکی اسی کو کہتے ہیں کہ وہ گھر سے بے گھر ہوئی، دشمنوں کے قبضے میں رہی اور اب وہاں سے آئی ہے۔‘‘

بیوی : ’’ہاں ہاں تو اِس میں اُس لڑکی کا کیا قصور۔ وہ عورت ذات، کمزور، مظلوم اس کا کیا بس چل سکتا تھا۔ جب تک وہ مجبور رہی دشمنوں کے قبضے میں رہی اور جب اس کو موقع مل سکا وہ پھر اپنوں میں آ گئی۔ اور اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو اپنائیں اور اُس کو محسوس بھی نہ ہونے دیں کہ وہ ہم سے کسی طرح کمتر ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’کس قدر خوش ہو رہی ہو گی جناب کے والد ماجد کی روح۔ اور میرے والد صاحب قبلہ کی روح تو یقیناً شکر ادا کر رہی ہو گی کہ بہو صاحبہ کی اِس تقریر دل پذیر کو سن کر خودکشی کرنے کے بجائے وہ پہلے ہی قدرتی موت مر گئے تھے۔ مگر تمہیں خدا کی قسم، یہ تمام باتیں تم

صرف مجھ کو جلانے کے لیے کرتی ہو یا واقعی تمہارا خیال یہ ہے کہ میاں مشتاق یہ نہایت مناسب شادی کر رہے ہیں۔‘‘

بیوی : ’’تم تو مشتاق کو کہہ رہے ہو۔ اللہ جانتا ہے اگر کوئی میرا لڑکا ہوتا اور اُس پر میرا بس چلتا تو میں اُس سے بھی یہی کہتی کہ بیٹا اپنے ماموں کی اِس مثال پر عمل کر۔‘‘

قاضی جی : ’’مجال تھی اُس کی۔ گولی مار دیتا میں اُس مردود کو۔ ایسی ننگ خاندان اولاد کے ہونے سے تو یہی اچھا تھا کہ وہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ عاق کر دیتا۔ صورت تک دیکھنے کا روادار نہ ہوتا اور اگر وہ مجھ کو باپ کہتا تو مقدمہ چلا دیتا اُس پر اپنی توہین کا۔ مگر میری ایسی قسمت کہاں تھی کہ میرے یہاں بھی اولاد ہوتی۔ اسی ارمان میں لگاتار پانچ شادیاں کر ڈالیں مگر خاندان کا چراغ روشن نہ ہو سکا اور اب کیا امید ہے۔ ع

آخر وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے‘‘

بیوی : ’’میں تو پھر یہی کہوں گی کہ مشتاق نے وہی کیا جو ایک سمجھدار۔ غیرت دار۔ فرض شناس مسلمان نوجوان کو کرنا چاہیے تھا۔‘‘

قاضی جی : ’’اصل میں یہ تمہارا قصور نہیں ہے بلکہ خطا میری ہے۔ سوچا یہ تھا کہ لاؤ بھائی یہ آخری شادی ذرا کسی لکھی پڑھی لڑکی سے کر ڈالیں اسی شوق کا نتیجہ ہے جو بھگت رہے ہیں۔ ارے صاحب ہمارے بزرگ جو تعلیمِ نسواں کے خلاف تھے تو کوئی خواہ مخواہ تھوڑی خلاف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ خدا کی یہ بیوقوف مخلوق تعلیم ہضم نہ کر پائے گی۔ اور لکھ پڑھ کر ایسی ایسی حماقتیں اس طبقہ سے سرزد ہوں گی کہ پھر ان کی کوئی پناہ نہ ہو گی۔ سوال تو یہ ہے کہ آخر مجھ خاکسار کی کیا شامت آئی تھی کہ ایک

بقراط کو بیاہ لایا۔‘‘

بیوی : ’’خیر یہ پشیمانی تو تم کو ہمیشہ رہے گی۔ مگر میں یہ بات کبھی نہیں مان سکتی کہ مشتاق نے اس انتخاب میں کوئی غلطی کی ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’غلطی کی ہو یا نہ کی ہو مگر میں اس شادی میں شرکت نہیں کر سکتا۔‘‘

بیوی : ’’تم شرکت نہ کرو گے تو میں بھی نہ کروں گی۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تمہاری مرضی کے خلاف بھائی کی شادی میں جا پہونچوں گی۔‘‘

قاضی جی : ’’لیجیے اب وہاں اخلاق شروع ہو گیا۔ مروت اور چشم مروت کے معاملات شروع ہو گئے اور اگر یہ دھونس ہے بلکہ۔ بلکہ آپ کی لیڈری زبان میں احتجاج کہنا چاہیے۔ یعنی اگر یہ احتجاج ہے تو بھی مجھ کو اس کی پروا نہیں۔ میں خدانخواستہ ایسا زن مرید نہیں ہوں کہ بیوی صاحبہ نے شروع کی تریاہٹ اور شوہر صاحب ایک دم ریشہ خطمی ہو گئے۔ تمام اصول طاق پر پہنچ گئے اور لگے بیوی صاحبہ کی خوشامد کرنے۔‘‘

بیوی : ’’تم مجھ کو بالکل غلط سمجھ رہے ہو۔ نہ میں یہ تریاہٹ جانتی ہوں اور نہ اس کی ضرورت سمجھتی ہوں۔ میرے سامنے اس وقت دو فرض ہیں۔ ایک یہ کہ حق بات کو حق کہوں سو دہ میں کہہ رہی ہوں کہ مشتاق نے انتخاب میں غلطی نہیں کی۔ دوسری بات یہ کہ مجھ کو ہر حال میں شوہر کا ساتھ دینا چاہیے لہٰذا چونکہ تم شریک نہیں ہو رہے ہو میں بھی شریک نہیں ہو سکتی۔‘‘

قاضی جی : ’’اب بتایئے اس قسم کی موقعوں پر ایک شوہر سوائے سر پیٹ لینے کے اور کیا کر سکتا ہے۔ یعنی تم مجھ کو صرف مارنا ہی نہیں چاہتی ہو بلکہ کھمبے سے باندھ کر مارنا چاہتی ہو۔ جو اصل بات تھی اُس میں تو آپ بھیا کی

طرفدار ہیں اور پھر اس لیے کہ شوہر کی سخت گیری بھی مسلم ہو جائے۔ آپ شرکت بھی نہیں کرنا چاہتیں اور شرکت نہ کرنے کا طریقہ ایسا اختیار کیا ہے کہ اگر شوہر ذرا بھی بیوقوف ہو تو آ جائے آپ کے چر کے میں۔‘‘

بیوی : ’’اب اس بدگمانی کا تو کوئی علاج نہیں۔ میں نے تو ایک اصولی بات کہی تھی۔‘‘

قاضی جی : ’’اللہ اکبر۔ یہ بھلا عورتوں کے الفاظ ہیں۔ آج تک ہمارے خاندان کی کسی کی عورت نے اتنا بڑا لفظ نہ بولا ہوگا۔ اصولی بات، تو یہ اصولی بات ہے جناب کی۔ بہرحال کچھ بھی ہو آپ شریک ہوں یا نہ ہوں آپ مناسب سمجھیں یا نامناسب، مگر میں قیامت تک نہ اس شادی میں شرکت کر سکتا ہوں نہ آپ کی بھاوج صاحبہ کو اپنے برابر کی سمجھ سکتا ہوں۔‘‘

بیوی : ’’ہاں ہاں اِس لیے کہ تم کو نہیں معلوم کہ اِسلامی مساوات کیا ہیں۔‘‘

قاضی جی : ’’اجی مجھ کو تو کچھ بھی نہیں معلوم۔ جاہل ہوں۔ کندۂ ناتراش ہوں احمق ہوں۔ آپ کے امکان میں ہو تو پھانسی لگا دیجیے مجھ کو۔ واللہ ہے کہ عجیب بے حیا زندگی پائی ہے اس خاکسار نے بھی تھو ہے۔ اس زندگی پر۔‘‘

(۱۰)

(قاضی جی گھبرائے ہوئے باہر سے آتے ہیں اور کسی چیز سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچتے ہیں۔)

قاضی جی : "لاحول ولاقوۃ۔ ٹوٹا ہوتا ابھی میرا منہ۔ دروازے کے سامنے ہی خدا جانے یہ کیا آخور جمع کیا گیا ہے۔ میں پوچھتا ہوں آخر یہ ہے کیا واہیات۔"

بیوی : "کچھ بھی نہیں مہاجرین کو بھیجنے کے لیے محلّہ سے کچھ لحاف۔ رضائیاں اور توشکیں جمع کی ہیں۔ اب اجمل بھائی لے کر جا رہے ہیں۔"

قاضی جی : "صاحب اس بات کو آج آپ صاف کر لیجیے کہ اس گھر کو میرا غریب خانہ رہنا ہے یا یہ آپ کے دم قدم سے مہاجر خانہ بن کر رہ جائے گا۔ جب دیکھیے یہاں اسی قسم کا کوئی نہ کوئی کارخانہ کھلا ہوا نظر آتا ہے۔ آج مہاجرین کے لیے کپڑے جمع کیے گئے ہیں۔ آج مہاجرین کو کھانا بھیجا جا رہا ہے۔ لہٰذا اس کا جھگڑا پھیلا ہوا ہے۔ اب یہ گودڑ میری جان کا عذاب بنا کر جمع کیا گیا ہے آخر میں پوچھتا ہوں یہ طریقہ کیا ہے۔"

اجمل : "قاضی جی ان باتوں پر تو آپ کو خوش ہونا چاہیے تھا کہ بھابی کی وجہ سے آپ کے گھر سے بھی وہ فرض پورا کیا جا رہا ہے جو اس وقت ہر

مسلمان پر عائد ہوتا ہے۔"

قاضی جی : "مسلمان؟ بس رہنے بھی دیجیے۔ جیسے کچھ آپ مسلمان ہیں اس کو میرا ہی دل خوب جانتا ہے۔ نہ نماز کے نہ روزے کے۔ بس یہ گودڑ جمع کر کے تقسیم کر آئے اور مسلمان ہو گئے۔ پاکستان کا جھنڈا بائیسکل میں لگا لیا اور مسلمان ہو گئے۔ چاند تارے کا بلّا لگا لیا اور مسلمان ہو گئے۔ ارے میاں مسلمان ہم ہیں۔ خدا کے فضل سے پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں۔ اس وقت قیامت کی سردی کو دیکھیے اور اندھیرے منہ اٹھ کر وضو کرنا ملاحظہ فرمائیے۔ تمہاری قسم رہے سہے تمام دانت بجنے لگتے ہیں۔"

اجمل : "ماشاء اللہ۔ خدا ہر مسلمان کو یہ توفیق دے۔ مگر قاضی جی اسلام اسی پر تو ختم نہیں ہو جاتا۔"

بیوی : "دوسرے یہ کہ نماز پڑھتے ہو تو اپنے لیے پڑھتے ہو۔ تمہاری نماز کسی دوسرے کے کام تو آ نہیں جائے گی۔ ہر مسلمان کو پڑھنا چاہیے نماز۔ مگر اللہ نہ کرے کوئی تمہاری طرح ڈھنڈورہ پیٹے۔"

قاضی جی : "ڈھنڈورہ؟ خوب یاد دلایا تم نے ڈھنڈورہ ہی سن کر تو میں دوڑا ہوا آیا تھا تمہارے پاس کہ تم کو بھی بتا دوں کہ پناہ گیروں کے لیے کپڑے کی کچھ دوکانیں کھولی گئی ہیں اور ان دوکانوں پر بس برائے نام قیمت پر کپڑا مل جاتا ہے۔ تو میں نے کہا کہ کہو کیا رائے ہے منگاتی ہو کچھ؟"

بیوی : "اللہ نہ کرے میں منگاؤں۔ پناہ گیروں کے لیے دوکانیں کھلی ہیں اور وہاں سے کپڑا لینے جائیں گے یہ۔"

قاضی جی : "کیوں؟ آخر اس میں کیا خرابی ہے۔ سستا مل جائے گا کپڑا۔ اچھا نہ

سہی معمولی ہی سہی۔ روزمرہ کے کام کا تو ہوگا۔''

بیوی : ''روزمرہ کے کام کا نہ سہی وہ زربفت اور جامے دار سہی، مگر اس کپڑے پر ہم کو کوئی حق نہیں ہے۔''

قاضی جی : ''پھر وہی عورت پن کی بات کی تم نے۔ ہم کو حق آخر کیوں نہیں ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میں مہاجر نہیں ہوں۔ میرے لیے بھی بالکل اسی طرح یہ جگہ پردیس ہے جس طرح مہاجرین کے لیے ہے۔ میں بھی یہاں کا رہنے والا نہیں ہوں۔ میں بھی باہر سے آیا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہی تو ہے کہ مہاجرین اب آئے ہیں اور ہم لوگ کوئی تین چار سال پہلے آگئے تھے۔ اور سچ پوچھو تو میری حالت تو مہاجرین سے بھی بدتر ہے۔ اور صاحب ان کے لیے تو بڑے بڑے فنڈ کھلے ہوئے ہیں۔ محکمے کے محکمے قائم ہیں۔ کوئی کوٹ لیے دوڑ جا رہا ہے کوئی پتلون۔ بڑے بڑے حکام سے لیکر خود جناب تک ان کے لیے نہ جانے کیا کیا جمع کرتی پھرتی ہیں۔ مجھ کمبخت کو پوچھنے والا کون ہے۔ اب تم ہی انصاف سے بتاؤ کہ مہاجر زیادہ وہ ہیں یا میں۔

بیوی : ''میں کہتی ہوں تم کو برا بھی نہیں لگتا ان بیچاروں سے اپنا مقابلہ کرتے ہوئے۔ اللہ نہ کرے تم پر کون سی مصیبت پڑی ہے۔''

قاضی جی : ''یعنی اتنی مصیبتیں میں نے گنا دیں اور اب تک جناب کی سمجھ میں میری کوئی مصیبت ہی نہیں آئی۔ غضب کرتی ہو بخدا تم بھی۔ ہر فائدے کے موقع پر تم نے اسی طرح مجھ کو بیوقوف بنالیا۔ جو عقل مند میری طرح اپنی بیویوں کے چغد نہیں تھے وہ آج مزا کر رہے ہیں۔ کوئی ہزاروں روپے کا فرنیچر سامنے بیٹھا ہے۔ کوئی لاکھوں روپیہ دبائے بیٹھا ہے۔ سینکڑوں آدمی کہو تو گنادوں کہ بن گئے وہ اس ہڑبونگ میں۔ ایک ہم ہیں کہ جیسے پھٹیچر پہلے تھے ویسے ہی خدا کے فضل سے اب ہیں۔ ہزار مرتبہ ان بیگم صاحبہ سے عرض کیا کہ صاحب یہی وقت ہے بننے یا بگڑنے کا۔ مگر خدا نہ کرے کہ کوئی کسی بیوقوف عورت کا شوہر ہو۔''

اجمل : ''قاضی جی معاف کیجیے گا۔ اس سلسلہ میں میری سمجھ میں تو یہ بات ہی نہیں آتی کہ آپ کا ساتھ ہوتے ہوئے بھی بھابی کیونکر وہ سب کچھ کر لیتی ہیں جو وہ کر رہی ہیں۔ زمین اور آسمان کا فرق ہے۔''

قاضی جی : 'اللہ آپ کے بچوں کو سلامت رکھے۔ واقعی زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ میں قدرتی طور پر جتنا دوراندیش۔ معاملہ فہم۔ ابن الوقت۔ یعنی۔ یعنی میرا مطلب یہ کہ جتنا وقت کا۔ وقت کا۔ گویا۔ وقت کو سمجھنے والا ہوں اسی قدر یہ چوپٹ واقع ہوئی ہیں ان باتوں سے۔ اگر اس نیک بخت نے شروع سے میرا کہنا مانا ہوتا تو آج سونے میں لدی ہوتی۔ بھلا غضب خدا کا! یہ سامنے والی حویلی میرے سامنے لوٹی گئی اور میں دیکھ دیکھ کر ترسا کیا۔''

بیوی : ''توبہ۔ توبہ۔ مسلمان ہوکر تمہاری نیت اس قدر خراب ہے۔''

قاضی جی : ''ملاحظہ فرمائیے ان کی عقلمندی۔ اب کون ان کو سمجھائے کہ صاحب ہم مسلمانوں کو لوٹنے نہیں جا رہے تھے۔ اگر لوٹنے کا ارادہ بھی تھا تو ان کو جو ہم کو لوٹ چکے ہیں۔ بھائی اجمل صاحب خدا جانتا ہے کہ میری پہلی بیوی کی خالہ کے داماد: بس یہ سمجھئے کہ تقریباً لکھ پتی ہوں گے ان کو اس

بری طرح ظالموں نے لوٹا ہے کہ بس تن کے کپڑوں کے ساتھ بیچارے بھاگ سکے۔ سوال یہ ہے کہ ہم آخر ظالموں کی پہلی بیوی کی خالہ کے دامادوں کو کیوں نہ لوٹیں۔''

بیوی : ''ہم اس لیے وہ باتیں نہیں کر سکتے کہ ہم مسلمان ہیں۔ نہ مسلمان کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ برائی کا بدلہ برائی سے لے، نہ مسلمان یہ کر سکتا ہے کہ بدلہ لینے کے لیے کوئی گناہ کر بیٹھے۔''

قاضی جی : ''کیا مطلب؟ یہ تو تم کچھ عجیب سی بات کہہ گئی ہو۔ یعنی تمہارا مطلب کیا ہے آخر؟ گویا آپ یہ چاہتی ہیں کہ۔ کہ۔ کہ اچھا خیر تم ہی کہو کہ تم چاہتی کیا ہو۔''

اجمل : ''قاضی جی بھابی نے بالکل صاف سی بات کہی ہے کہ مسلمانوں اور دوسروں میں فرق صرف یہی ہے کہ مسلمان بُرے سے بُرے حالات میں بھی اپنے کو بُرا بنا کر پیش نہیں کر سکتے۔''

قاضی جی : ''صاحب میرا تو ارادہ یہ ہے کہ میں اب خودکشی کر لوں۔ آپ کی کیا رائے ہے۔ یعنی آپ دونوں نے آپس میں یہ سمجھ رکھا ہے اور یہ طے کر رکھا ہے کہ ایک دوسرے کی تائید ضرور کریں گے۔ اس طرفداری کی بدولت میرے ساتھ اس گھر میں وہ سلوک ہو رہا ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ سننے میں آتا ہے۔ یعنی مجھ کو اب گویا اس گھر پر کوئی حق ہی نہیں ہے۔ کبھی تو میری بھی کسی بات کی آپ نے تائید کی ہوتی۔''

اجمل : ''آپ تو خفا ہو جاتے ہیں قاضی جی۔ میرا مطلب تو یہ تھا کہ آپ خود اپنے کو ملاحظہ فرمائیے۔ پانچوں وقت کی آپ نماز خدا کے فضل سے

پڑھتے ہیں۔''

قاضی جی : ''پھر بھی میں بڑا گناہگار ہوں۔ مگر اتنا جانتا ہوں کہ جان بوجھ کر تو نماز چھوڑتا نہیں۔ اب گھڑی ہی بند ہو جائے اور الارم ہی نہ بجے صبح تو دوسری بات ہے۔ ارے بھئی اجمل کسی سے ہماری گھڑی ہی درست کرا دو یار۔ دو مہینہ سے ٹوٹی پڑی ہے۔''

بیوی : ''اجمل بھائی ان کی اسی بات پر تو مجھ کو تعجب ہے کہ۔۔۔۔''

قاضی جی : ''اجی آپ کو تو میری ہر بات پر تعجب ہوگا۔ میں تو آپ کے نزدیک ایک، ایک سرے سے عجیب الخلقت ہوں۔ مجھ کو تو آپ گویا تفریح طبع کے واسطے عجائب خانہ سے خرید کر لائی ہیں۔ میں شوہر تو خیر اخلاقاً ہوں۔ ورنہ ہوں دراصل میں جناب کا کوئی پالتو جانور از قسم کاکاتو۔ شتر مرغ۔ بارہ سنگھا وغیرہ۔

بیوی : ''توبہ ہے۔ بات تو سنا کرو کسی کی۔ میں تو تمہاری کچھ تعریف ہی کر رہی تھی۔''

قاضی جی : ''میری تعریف؟ خیر مجھ روسیاہ میں تعریف کی تو کوئی بات ہی نہیں ع

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا

مگر خیر تم کہہ کیا رہی تھیں کچھ میرے متعلق۔''

بیوی : ''میں یہ کہہ رہی تھی کہ مجھ کو تم پر اس معاملہ میں بڑا تعجب ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے جو سب سے بڑی چیز ہے۔ اس کے تم بیحد پابند ہو یعنی نماز۔ پھر آخر تم دوسری چھوٹی چھوٹی باتوں میں کیوں ڈگمگا جاتے ہو۔ تم تو بڑی آسانی سے اپنے کو ایک سچے مسلمان کا نمونہ بنا سکتے ہو۔''

قاضی جی : ’’زندگی بھر میں پہلی بات تم نے کچھ سمجھا کر مجھ سے کی ہے۔ اگر اسی طرح خوش اخلاقی۔ محبت اور پیار سے بات سمجھائی جائے تو بچہ ہو یا بوڑھا۔ ہر ایک کی سمجھ میں بات آسکتی ہے۔ بلکہ مارنے سے تو بچہ بے حیا بھی ہو جاتا ہے۔ خیر یہاں تو میرا ذکر ہے اور میں کوئی ایسا ناسمجھ بھی نہیں ہوں۔ مگر یہ الزام مجھ پر سراسر غلط ہے کہ میں ڈگمگا جاتا ہوں۔‘‘

بیوی : ’’اب یہ ڈگمگانا نہیں تو اور کیا ہے کہ تم ہر وقت اسی پر افسوس کرتے رہتے ہو کہ تم کو میں نے لوٹ مار میں حصہ نہیں لینے دیا۔ یہ شان ایک مسلمان کی نہیں ہوسکتی۔‘‘

قاضی جی : ’’ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر ٹھیک کیسے ہے صاحب، اس قسم کی چالاکی مجھ کو زہر لگتی ہے کہ گھما پھرا کر آپ نے ایک غلط بات مجھ سے کہلوالی۔ یعنی آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں جو آپ کے کہنے سے گویا بیوقوف بنا ہوں تو ٹھیک بنا ہوں۔ مجھ کو گویا بننا ہی چاہیے تھا بیوقوف۔ گویا میں تھا ہی اس قابل کہ اور سب تو مزے اڑائیں اور میں بودم بنا بیٹھا رہوں۔‘‘

بیوی : ’’پھر وہی۔ اللہ ہی تم پر رحم کرے۔ اتنی دیر تک تم کو سمجھایا مگر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔‘‘

قاضی جی : ’’اجی تمہارے سمجھانے سے کیا ہوتا ہے۔ تمہاری قوم کے سمجھانے سے ہماری قوم جنت سے نکالی گئی۔ بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا کیا پٹی پڑھا کر گیہوں کھلوا دیا۔ اب آپ چلی ہیں مجھ کو سمجھانے۔ اعلیٰ درجہ کا فرنیچر آپ ہی کے بدولت ہاتھ سے گیا۔ ریڈیو، بجلی کے پنکھے۔ بجلی کی انگیٹھی۔ ارے صاحب بالکل ویسی ہی جنت تھی جس سے دادا دادی ہی تو ہوئے نا! ہاں ٹھیک ہے دادا ... یعنی دادا جس جنت سے نکالے گئے تھے۔‘‘

اجمل : ’’قاضی جی اس وقت تو مجھ کو امید بندھ چلی تھی کہ شاید آپ بات سمجھ جائیں گے۔‘‘

قاضی جی : ’’یعنی آپ لوگوں کے چکموں میں آجاؤں گا۔ خیر مجھ سے یہ امید آپ نہ رکھیے۔ اور نہ میں ایسا زن مرید ہوں کہ جو بات میری سمجھ میں نہ آئے وہ گویا میں بیگم صاحبہ کی مان لوں۔ ہمارے یہاں کی خواتین یعنی مستورات...... ارے بھئی میرا مطلب ہے عورتوں سے کہ ہمارے یہاں کی عورتیں مردوں کے معاملات میں نہیں بولتیں۔ اور اگر بولیں تو مردوں کو چاہیے کہ وہ ذرا سوچ سمجھ کر ان کی باتیں سنیں۔ اب دیکھ لیجیے نا کہ اسی وقت میں تقریباً کھا ہی گیا تھا غچہ۔‘‘

بیوی : ’’کہہ تو دیا کہ خدا ہی تم پر رحم کرے۔ مگر اتنا میں پھر کہوں گی کہ یہ باتیں جو تم کرتے ہو وہ مسلمانوں کی شان کے مطابق نہیں ہیں۔ مسلمان کو اسی قسم کے موقع پر یہ ثابت کرنا چاہیے کہ وہ مسلمان ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’اب تک تو جناب صرف لیڈر ہی بن رہی تھیں۔ پیری مریدی کا بھی شوق ہوا ہے۔ اور سب سے پہلا شخص جس کو جناب حلقہ بگوش کرنا چاہتی ہیں وہ گویا یہی خاکسار ہے۔ مطلب یہ کہ اب گویا میں بیگم صاحبہ کے دستِ مبارک پر بیعت کروں گا۔ ارے صاحب اسی کو زن مریدی کہتے ہیں۔ اور میں اُن شوہروں میں سے ہوں جو مر جانا گوارا

کرلیں گے۔ مگر بیوی کے مرید بن کر نہیں رہ سکتے۔ ع

بردایں دام برمرغ وگرنہ

مگر نہیں مرغ وگروالی بات بھی غلط ہے۔ مطلب یہ کہ بخشو بلی چوہا لنڈورہ ہی بھلا۔''

(۱۱)

(قاضی جی نزلہ زکام میں مبتلا ہیں۔ بیوی زبیدہ، محمود سب حاضر ہیں)

قاضی جی : (کراہنے کے بعد) توبہ ہے۔ ارے صاحب توبہ ہے۔ یہ نزلہ بھی وہ ناشدنی بیماری ہے کہ بظاہر کوئی بیماری نہیں اور اگر غور کیجیے تو ہر بیماری کی جڑ یہی ہے۔ آہ۔ اُف۔ گلہ خشک۔ ناک سے گویا ہر قسم کا ترک تعلق۔''

زبیدہ : ''آپ کچھ گھبراتے بھی زیادہ ہیں بھائی جان ورنہ نزلہ کس کو نہیں ہوتا۔''

قاضی جی : ''ہائے۔ اُف۔ افوہ۔ یعنی سانس لینے کے دوراستوں میں سے ایک راستہ جواب دے جائے اور آپ کے خیال میں یہ کوئی گھبرانے کی بات ہی نہیں ہے۔''

بیوی : ''میں تو کل سے چیخ رہی ہوں کہ جوشاندہ پی لو مگر......''

قاضی جی : ''صاحب یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ میں آپ کا علاج شروع کردوں اور جو کوئی پوچھے کہ کس کا علاج ہے تو کہنا پڑے کہ بیگم صاحبہ معالج ہیں۔ ہر بات میں جناب کو دعویٰ ہے اب طبابت میں بھی دخل ہو گیا۔ لعنت ہے اُس شوہر پر جو زن مریدی کی یہ انتہا کردے کہ بیوی سے علاج بھی کرانے لگے۔ مرغیوں اور کبوتروں کا علاج کرتے کرتے اب

آپ کو یہ غلط فہمی بھی ہوگئی ہے کہ آپ انسانوں کا بھی علاج کر سکتی ہیں۔ یا آپ مجھ کو بھی منار کا یا شیرازی قسم کا مرغ یا کبوتر سمجھتی ہیں۔

(دروازے پر دستک)

آواز : ''قاضی صاحب، جناب قاضی صاحب۔

قاضی جی : ''دیکھنا بھئی محمود کون صاحب ہیں۔ میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ کوئی بہانہ کر کے ٹال دینا جو صاحب بھی ہوں۔''

آواز : ''قاضی صاحب تشریف رکھتے ہیں؟''

محمود : ''(جاتے ہوئے) کون صاحب ہیں؟ حاضر ہوا۔''

قاضی جی : ''لاحول ولاقوۃ۔ ان عقل مند کو میں نے کوئی بہانہ خود ہی بتا دیا ہوتا تو اچھا تھا۔ خدا جانے کیا اُلٹی سیدھی بات کہہ دیں گے۔ عقل تو ان صاحبزادے میں چھو نہیں گئی ہے۔''

بیوی : ''اب ایسا بھی وہ گیا گذرا نہیں ہے۔ ہاں سیدھا ضرور ہے۔''

قاضی جی : ''صاحب اس شکل کے لوگ جن کا چہرہ لمبا ہو اور گول گول آنکھیں جھپکتی کم ہوں۔ عام طور پر بڑے گھامڑ ہوتے ہیں۔

زبیدہ : ''بھائی جان وہ آرہا ہے سن نہ لے کہیں۔''

محمود : (آتے ہوئے) ''شیخ صاحب کا انتقال ہوگیا۔''

بیوی : ''ہے ہے۔ کب۔''

قاضی جی : ''ٹھہریئے تو صاحب انتقال تو خیر ہوگیا۔ مگر تم نے کیا کہہ دیا۔''

محمود : ''اس خبر کے بعد میں کیا کہتا۔ وہ تو کہنے آیا تھا۔ میت دس بجے اٹھے گی۔''

قاضی جی : ''دیکھ لیا آپ نے۔ یہی تو موقع تھا بہانے کا۔ ارے بھئی کہہ دیتے کہ میں کہیں باہر گیا ہوا ہوں۔ ایک تو میں بیمار۔ اس کے علاوہ یہ غمی کی شرکت میرے لیے ایک مصیبت ہوتی ہے۔ مگر خدا جانے کیا بات ہے کہ جہاں کوئی مرا، سب سے پہلے مجھ ہی کو اطلاع دی جاتی ہے۔ شادیوں کا بلاوا دینا لوگ بھول سکتے ہیں۔ دعوتوں کا رقعہ بھیجنا بھول سکتے ہیں مگر اس منحوس اطلاع کے لیے میں سب سے پہلے یاد آتا ہوں۔''

زبیدہ : ''مگر بیچارے ایسے بیمار بھی تو نہیں تھے۔''

بیوی : ''کیسا کچا ساتھ ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے غریب کے۔''

قاضی جی : ''وہ تو سب کچھ ٹھیک ہے صاحب۔ مگر مجھ پر بیٹھے بٹھائے یہ کیا مصیبت آئی۔ کہ اب وہاں جا کر کفن دیکھوں۔ کافور کی بو سونگھوں۔ لمبا لمبا مردہ پڑا ہوا دیکھوں۔ میں اختلاجی آدمی مجھ کو ہمیشہ ان چیزوں سے وحشت ہوتی ہے اور اگر کسی نے کہہ دیا مجھ سے کندھا دینے کو۔ بتایئے میں کیا کروں گا۔ صاحب میں تو نہیں جا سکتا وہاں۔''

بیوی : ''بھلا یہ بھی کوئی بات ہے شیخ صاحب سے تمہارے تعلقات ایسے تو نہ تھے کہ اب تم ان کے جنازے میں بھی شرکت نہ کرو۔''

قاضی جی : ''اے جناب مجھ کو غور کر کر کے وحشت ہو رہی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے ان کا مردہ گھوم رہا ہے۔ بھئی خدا کے واسطے کوئی اور ذکر کرو۔ جانتی ہو کہ اس تذکرے سے میرا کیا حال ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ میں بیمار آدمی۔ ہاں تو جوشاندہ کے متعلق تم کیا کہہ رہی تھیں۔''

زبیدہ : ''میری رائے یہ ہے کہ آپ کو جانا ضرور چاہیے۔''

قاضی جی : ''پھر وہی بات۔ آپ لوگ آخر کیوں میری جان کے پیچھے پڑ گئی

ہیں۔ میرا دم اُلٹنے لگتا ہے کسی جنازے میں شرکت کے خیال ہی سے۔ مجھ کو اگر دحشت ہوتی ہے کسی بات سے تو یہ مرنے والا قصہ ہے۔ اب آپ یقین جانئے کہ مہینہ بھر تک عجیب عجیب ڈراؤنے خواب دیکھتا رہوں گا شیخ صاحب کے متعلق۔ اور اگر وہاں چلا گیا اور میں نے اپنی آنکھوں سے کفن دفن دیکھ لیا تو یہ سمجھ لو کہ شروع ہوئے اختلاج کے دورے۔’’

بیوی : ‘‘میں بتادوں۔ تم جا کر ان کے لڑکے سے بس یہ کہہ دینا کہ میں بیمار ہوں قبرستان تک نہیں جاسکوں گا۔ مطلب یہ کہ بس صورت دکھا کر چلے آؤ۔ ورنہ کہنے کی بات رہ جائے گی کہ یا تو اتنے تعلقات تھے یا آئے بھی نہیں۔’’

قاضی جی : ‘‘تو کیا مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی میں تعلقات رکھو۔ سبحان اللہ۔ مجھ کو اگر یہ خبر ہوتی پہلے سے تو کون مردود اُن حضرت سے علیک سلیک کا بھی روادار ہوتا۔ تو خیر میں نے کہا نزلہ میں بھونسی بھی تو ابال کر پیتے ہیں۔’’

زبیدہ : ‘‘بھائی جان آپ محمود کو لیجیے ساتھ اور جا کر بس صورت دکھا آیئے۔

بیوی : ‘‘ورنہ بڑی شکایت کی بات ہوگی یہ۔ تم سے اور شیخ صاحب سے تو بڑی بے تکلفی تھی۔’’

قاضی جی : ‘‘خدا کے واسطے اب ان کا ذکر چھوڑیئے۔ صاحب وہ بیچارے اچھے آدمی تھے۔ مر گئے۔ اس کا افسوس ہوا مگر اب ان کے مردے کو آپ بے تکلفی بھی گویا یاد دلا رہی ہیں۔ رہ گیا وہاں جانا۔ اس کی بس ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں غمی کی شرکت کا ہمیشہ کچا ہوں۔

تمہاری جان سے دور اب تک ماشاء اللہ اتنی بیویاں مری ہیں، مگر قسم لے لو جو کسی کے جنازے میں شرکت کی ہو۔ ہمیشہ بیہوش ہو کر گھر ہی پر رہ جاتا تھا۔

بیوی : ‘تو نہ کرنا تم جنازے میں شرکت۔ بس وہاں ہو کر چلے آؤ۔ محمود کو ساتھ لیتے جاؤ۔’’

قاضی جی : ‘‘بہتر ہے صاحب۔ جاتا ہوں۔ دفعان ہوتا ہوں۔ لاؤ میاں محمود۔ میری شیروانی اور چھڑی۔ مگر بھائی خدا کے واسطے مجھ کو چھوڑ کر کسی طرف کھسک نہ جانا۔ یہ تمہاری ہی حماقت کا نتیجہ بھگت رہا ہوں۔ اگر عقل سے کام لے کر کہہ دیتے کہ میں شہر کے باہر گیا ہوا ہوں۔ تو کیوں میری جان پر شرکت کی یہ سولی ہوتی۔’’

محمود : ‘‘یہ لیجیے شیروانی۔’’

قاضی جی : ‘‘میں کہتا ہوں اگر میں گیارہ بجے کے قریب جاؤں تو کیسی رہے۔ یعنی تعزیت بھی ہو جائے گی اور جنازہ بھی اُٹھ چکا ہوگا۔’’

زبیدہ : ‘‘توبہ ہے بھائی جان اب ایسا بھی کیا۔’’

بیوی : ‘‘تم اسی وقت ہو آؤ کوئی تم کو وہاں روکے گا نہیں بیماری کا عذر سن کر۔’’

قاضی جی : ‘‘اچھا صاحب اچھا۔ آؤ بھئی محمود۔ اب تو بس کاریگری تمہاری ہے کہ کوئی مجھ کو وہاں روکنے نہ پائے۔’’

محمود : ‘‘آپ اطمینان رکھیے۔’’

قاضی جی : ‘‘اطمینان کہاں اب برخوردار۔ دل ہاتھوں اُچھل رہا ہے۔ مگر خیر۔

(چلتے ہیں)

بیوی : ‘‘(آواز دے کر) واپسی میں کوئی ہری ترکاری یا پان لے کر گھر میں

آنا۔''

قاضی جی : ''(دور سے) ہاں صاحب ہاں۔ جانتا ہوں یہ شگون۔''

زبیدہ : ''توبہ ہے۔ سچ مچ بھائی جان بھی بس عجیب آدمی ہیں۔''

بیوی : ''یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں۔ غمی کی شرکت سے وہ ہمیشہ رسیاں تڑاتے ہیں۔''

زبیدہ : ''وہ پڑوسی ٹھیکہ دار صاحب یاد ہیں، جن کی لاش کو قبر میں اتارنے کے لیے کسی نے بھائی جان سے کہہ دیا تھا۔''

بیوی : ''توبہ ہے اس پر تو وہ قیامت آئی تھی کہ وہ لوگ بھی کیا یاد کرتے ہوں گے۔ مگر ایک بات ہے، تمہارے بھائی جان بنتے نہیں بلکہ ان کو واقعی وحشت ہوتی ہے۔''

زبیدہ : ''وحشت کس کو نہیں ہوتی مگر بھائی جان کچھ ضرورت سے زیادہ گھبراتے ہیں۔ محلہ میں کوئی موت اللہ نہ کرے ہو جائے پھر دیکھیے بھائی جان کا رنگ۔ مہینوں تنہا کمرے میں نہیں سو سکتے۔ ایک منٹ کے لیے بھی چراغ گل ہو جائے تو آفت مچا دیتے ہیں۔''

(باہر سے آواز آتی ہے)

خلیق : ''ارے صاحب میں آسکتا ہوں خلیق۔''

بیوی : ''زبیدہ۔ تمہارے دولہا۔ آجاؤ نا خلیق میاں۔ غفور جا دیکھ دولہا میاں آئے ہیں سامان وامان اترواؤ۔''

خلیق : ''(آتے ہوئے) السلام علیکم۔''

زبیدہ : ''آپ بغیر اطلاع کے کیسے تشریف لے آئے۔''

خلیق : ''اطلاع دینے کے بعد خوشی کی وہ جو ایک اچانک کیفیت ہوتی ہے وہ باقی نہیں رہتی۔ حیرت اور مسرت۔ شک اور یقین۔ مگر فی الحال سامان اتروالوں پھر سرکار کی دربارداری کروں گا۔''

بیوی : ''تم بیٹھو۔ وہ گیا ہے غفور سامان اُتروانے۔''

خلیق : ''اور بھائی جان کہاں تشریف لے گئے۔''

زبیدہ : ''میرے اللہ ذرا دیر پہلے نہ پہونچے آپ۔ بھائی جان کے دوست شیخ صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ جنازہ میں شرکت تو آپ جانتے ہیں بھائی جان کے لیے کتنی بڑی مصیبت کی چیز ہے۔''

خلیق : ''کچھ نہ پوچھیے۔ اس سلسلہ میں تو بھائی جان کا کوئی کارنامہ اگر تنہائی میں کبھی یاد آجاتا ہے تو پھر ہنسی نہیں رکتی۔ آپ کو وہ تو یاد ہوں گے بنن صاحب بھائی جان۔''

بیوی : ''کون بنن صاحب؟ بوتا کے باپ تو نہیں۔''

خلیق : ''جی ہاں، جی ہاں وہی بنن صاحب۔ ارے صاحب ان کے انتقال کے سلسلہ میں بھائی جان پر جو گذری ہے اس کا تو جواب ہی نہیں صاحب۔ ہوا یہ کہ بحیثیت پڑوسی کے آپ ہی کے سر سارا انتظام آپڑا۔ رات کو دو بجے کا وقت اور آپ کو جانا پڑا تابوت کا انتظام کرنے۔ اب جو وہاں جا کر دیکھتے ہیں تو نیچے سے اوپر تک تلے اوپر تابوت تو رکھے ہیں مگر آدمی کوئی نہیں۔ سناٹے کا عالم، بھیانک تاریکی، تابوتوں کا سامنا۔ مگر بیچارے مجبور تھے۔ آپ نے پکارنا شروع کیا۔ ارے بھئی کوئی ہے کہ یکایک ان تابوتوں نے ہلنا شروع کیا۔''

زبیدہ : ''ہائے اللہ۔ تابوتوں نے ہلنا شروع کیا۔

خلیق : ''جی ہاں، اور صاحب ہمارے بھائی جان ابھی گھبرا ہی رہے تھے کہ

اوپر والے تابوت سے نکلا ایک مردہ۔''

بیوی : ''اوئی اللہ۔ مردہ نکلا۔''

زبیدہ : ''ہئے بھی' ایسا جھوٹ میں نے آپ ہی کو بولتے سنا ہے۔''

خلیق : ''ارے صاحب سنئے تو سہی۔ تو ہوا یہ کہ تابوت سے جو نکلتے دیکھا بھائی جان نے مردہ تو چیخ مار کر بھاگے وہاں سے۔ اب آگے آگے آپ اور پیچھے پیچھے مردہ آپ کو پکارتا ہوا کہ میاں ٹھہریئے تو سہی بات تو سنئے۔''

بیوی : ''اے بھیا خدا کے واسطے اتنا جھوٹ تو نہ بولو اوپر آسمان ہے۔''

خلیق : ''بھابی جان آپ چاہے جس سے پوچھ لیجیے گا ایک لفظ اس میں جھوٹ نہیں ہے۔ اصل میں واقعہ یہ تھا کہ وہ تابوت والا کمبخت رات کو تابوت کے اندر ہی سویا کرتا تھا کہ اگر رات بے رات کوئی آجائے تو وہ جاگ سکے۔ مگر بھائی جان اس کو مردہ سمجھ کر ایسا وہاں سے بھاگے ہیں کہ جس وقت وہ بنن صاحب کے دروازے پر پہونچے ہیں بید کی طرح کانپ رہے تھے۔ بات منہ سے نہ نکلتی تھی۔

بیوی : ''اس موقع پر تو کوئی بھی ہوتا دہل جاتا۔ پھر وہ تو کمزور قلب کے ہیں ہی۔''

(قاضی صاحب داخل ہوتے ہیں)

قاضی جی : ''(آتے ہوئے)''لاحول ولا قوۃ۔ توبہ۔ توبہ۔ خلیق۔ آداب عرض ہے بھائی جان! اخاہ۔ اخاہ خلیق میاں ہیں۔ ارے بھئی تم کہاں یعنی میرا مطلب یہ کہ تم ایک دم کیسے آگئے۔ نہ کوئی خط نہ تار نہ کوئی اور اطلاع۔ کہو خیریت تو ہے سب یعنی زبیدہ کیسی ہیں۔ مگر۔ مگر۔ زبیدہ تو

یہیں موجود ہیں (ہنسی) بھئی اس وقت اصل میں میرے حواس درست نہیں ہیں۔ ایسی جگہ سے آرہا ہوں کہ بس اب کیا کہوں۔''

خلیق : ''سنا ہے شیخ صاحب بیچارے کا انتقال ہوگیا۔''

قاضی جی : ''جی ہاں وہی مثل کہ ع موت سے کس کو رستگاری ہے ...... آج وہ کل ...... آج وہ کل ...... میرا مطلب یہ کہ آج وہ گئے ہیں کل اور لوگوں کی بھی گویا باری آسکتی ہے۔ مگر صاحب یہ موت ہوتی بڑی افسوسناک چیز ہے۔ اب اس وقت ان کے گھر میں ایک کہرام مچا ہوا ہے۔ دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔ اندر سے عورتوں کے رونے کی آوازیں اس بری طرح آرہی تھیں کہ میں تو بوکھلایا جاتا تھا۔ آخر ان کے لڑکے کو بلا کر بہت کچھ سمجھایا بجھایا کہ بیٹا اب صبر کرو۔ وہ تو جنت کا پھول تھے جو بن کھلے مرجھا گئے۔ مگر بیٹا مشیت ایزدی میں کیا چارہ خدا تم کو نعمت بدل دے گا۔''

خلیق : ''جی؟ نعم البدل؟''

قاضی جی : ''ارے اب میں اور کیا کہتا۔ مگر وہ لونڈا ایسا احمق ہے کہ لگا مجھ کو گھورنے اور مجھ کو ہوئی وحشت کہ لاکھ کچھ ہو مگر یہ ہے اس وقت ایک مردے کی لاش۔''

بیوی : ''مگر تم نے بھی تو کمال کیا کہ باپ کے مرنے پر لڑکے سے کہہ آئے کہ خدا نعم البدل دے۔''

قاضی جی : ''یعنی اب اس میں بھی کوئی عیب ہوگیا۔ تمہاری جان سے دور میری جس قدر بیویوں نے انتقال کیا سب نے مجھ سے کچھ اسی قسم کی باتیں کیں اور ہوتی بھی یہی باتیں ہیں۔

زبیدہ : ''بھائی جان نعم البدل کا مطلب تو یہ ہے کہ خدا اس کا بدلہ دے گا۔ مگر باپ کا بدلہ آخر کون لینا چاہے گا۔''

قاضی جی : ''وہ۔ وہ تو خیر۔ خیر۔ بہرحال صاحب وہاں تو آئے حواس جاتے رہتے ہیں انسان کے۔ ایک تو لوگ اس بری طرح روتے ہیں کہ توبہ توبہ۔ ارے بھئی آخر ہماری بھی تو خدا جانے کتنی بیویاں مریں مگر ہم نہ چیخے نہ چلائے۔ شرافت کے ساتھ منہ پر رومال رکھ لیا اور ایک آدھ آنسو جو بہہ گیا اس کو پونچھ لیا۔ پھر یہ کہ صاحب روئی آ رہی ہے۔ چٹائیاں آ رہی ہیں۔ ٹیسو کے پھول آ رہے ہیں۔ میت کو غسل دینے کے لیے پانی کی دیگیں چڑھی ہوئی ہیں۔ کفن پھیلائے ہوئے درزی بیٹھا ہے۔ کافور کی بو تمام میں پھیلی ہوئی ہے توبہ توبہ۔ خیر بھئی چھوڑو اس ذکر کو دم الجھتا ہے۔ ہاں تو کیا حال ہے کراچی کا خلیق میاں۔''

خلیق : ''یہ بیمار کیا ہوئے تھے شیخ صاحب؟''

قاضی جی : ''ارے بھئی پرسوں تک اچھے خاصے تھے۔ سنا ہے کہ شام کو نہا لیے بس نزلہ ہو گیا۔ رات ہوتے ہوتے حرارت سی ہو گئی۔ مگر صاحب خدا کے واسطے یہ ذکر چھوڑیئے مجھ کو وہم آتا ہے۔ کلیجہ ہل جاتا ہے اس خیال سے کہ مجھ کو بھی تو ان کی جان سے دور نزلہ اور حرارت وغیرہ ہے۔''

بیوی : ''توبہ ہے۔ اللہ نہ کرے۔ جو بات سمجھ میں آتی ہے موئی ایسی ہی آتی ہے سچ مچ۔ کوئی اور بات کرو۔''

قاضی جی : ''مجھ کو تو واللہ تم یاد آ رہی تھیں جب اندر سے شیخ صاحب کی بیوی کی رونے کی آواز آتی تھی اور میں اس خیال سے گھبرا گھبرا کر کانوں

میں انگلیاں دے لیتا تھا۔ تو خیر۔ ہاں بھئی خلیق میاں تو گویا خوب سیر سپاٹے رہے کراچی میں۔ سمندر تو دیکھا ہی ہوگا۔''

خلیق : ''جی ہاں خوب دیکھا سمندر بھی اور خوب سیر کی۔ جگہ اچھی ہے کراچی۔''

قاضی جی : ''جگہ اچھی ہے؟ مگر میں نے تو سنا ہے کہ وہاں اب جگہ ہے ہی نہیں۔ لوگ تلے اوپر بھرے ہوئے ہیں کھچا کھچ۔ اس کا مطلب یہ کہ مکان بھی نہ ملتے ہوں گے رہنے کو۔''

خلیق : ''توبہ کیجیے مکان کا تو نام ہی نہ لیجیے۔ جس قیمت میں پہلے مکان بن جایا کرتے تھے وہ قیمت اب پگڑی وغیرہ کے سلسلہ میں کرایہ پر مکان لینے میں چھو ہو جاتی ہے۔ اور اب تو اس طرح بھی مکان مشکل ہی سے کسی خوش نصیب کو مل سکتا ہے۔''

زبیدہ : ''بات یہ ہے نا کہ باہر سے آنے والوں نے لاہور اور کراچی دو ہی شہروں کا رُخ کر رکھا ہے۔ آخر جگہ کہاں تک نکلتی چلی جائے۔''

قاضی جی : ''اس کے علاوہ اور تو کوئی تکلیف نہیں وہاں۔ مثلاً۔ مثلاً۔''

خلیق : ''اور تو کوئی خاص تکلیف نہیں البتہ ایک بات میں لاہور اور کراچی ہر جگہ۔ عام دیکھ رہا ہوں کہ باہر سے آنے والے تکلیف تکلیف تو پکارا کرتے ہیں مگر اُس تکلیف کو دور کرنے کی خود کوشش نہیں کرتے۔''

قاضی جی : ''وہ بیچارے کیسے کسی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں۔ ارے بھئی کراچی ہو یا لاہور ان کے لیے تو گویا پردیس ہی ہے۔ وہی مثل کہ نیا دانا نیا پانی اور دانے کی بات یہ ہے کہ گھوڑوں کی صحت روز بروز گرتی چلی جا رہی ہے۔ تانگے والوں نے کرایہ بڑھا رکھا ہے کہ صاحب دانا مہنگا ہے۔

کوئی پوچھے ان مسخروں، سے کہ بھائی جس طرح چنا مہنگا ہے اُسی طرح گیہوں بھی مہنگا ہے۔ میرا مطلب یہ کہ اس وقت صرف گھوڑے ہی نہیں آدمی بھی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ بلکہ گیہوں میں تو ایک تہائی جو بھی ملنے لگے ہیں۔ جس طرح آدمیوں میں ایک تہائی گھوڑے۔''

بیوی : ''دانے کا ذکر آیا اور گھوڑوں کو لے دوڑے۔ بات کچھ ہو رہی تھی چھیڑ دی کچھ اور بحث۔''

قاضی جی : ''خیر وہ کوئی اور بحث سہی مگر ہے تو یہ بھی ضروری بات۔ آج نہ چھڑتی تو کل چھڑتی۔ بہر حال تو ذکر تھا کچھ دیس اور پردیس کا۔ ٹھیک ہے وہ: میں یہ عرض کر رہا تھا یعنی کہہ رہا تھا کہ باہر سے آنے والے بیچارے نئے نویلے وہ آخر اپنی تکلیفوں کا علاج کیسے کر سکتے ہیں۔''

خلیق : ''آخر وہ کب تک نئے نویلے اور انجان بنے رہیں گے۔ اب تو یہی پردیس ان کا دیس ہے۔ ان کو سمجھنا چاہیے کہ جس طرح مکان بدلنے کے سلسلہ میں ایک نئے مکان میں تھوڑی بہت اجنبیت ضرور ہوتی ہے مگر انسان اس کو اپنا سمجھ کر اپنے آرام کے مطابق اس کو ٹھیک کر ہی لیتا ہے۔''

قاضی جی : ''یہ مثال تو صاحب بالکل غلط ہے۔ بالکل کیا یعنی سراسر غلط ہے۔ گھر ایک دوسری چیز ہے اور نیا شہر ایک دوسری چیز۔ یعنی آپ نے کسی گھر کے اندر شہر نہیں دیکھا ہوگا اور ہر شہر کے اندر گھر البتہ بے شمار ہوتے ہیں یعنی اس کو یوں سمجھئے کہ مثلاً آپ ایک شہر ہیں یعنی فرض کر لیجیے کہ آپ آدمی نہیں بلکہ کراچی ہیں سمجھے آپ یعنی آپ کراچی ہیں۔ مگر نہیں بات تو کچھ اور ہوگئی۔ ہاں تو آپ پھر سے کہیے کہ کیا کہہ رہے تھے۔''

بیوی : ''آدمی کا سر چکرا جائے تمہاری باتیں سن کر۔''

قاضی جی : ''ہیں ہی یہ پیچیدہ مسائل۔ عالمانہ بحث ہے سر چکرائے گا نہیں تو کیا رہ جائے گا۔ ہاں تو خلیق صاحب آپ کیا فرما رہے تھے؟''

خلیق : ''میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ باہر سے آنے والے یا تو اس کے قائل ہو جائیں کہ جیسا دیس ویسا بھیس یا اپنی مرضی کے مطابق خود حالات پیدا کرنے اور اپنے آرام کی خود صورتیں نکالنے کی کوشش کریں۔''

زبیدہ : ''جی نہیں ہاتھ پیر تو ہلانا ہی نہیں چاہتے یہ لوگ۔''

قاضی جی : ''یہ کیا بات ہوئی۔ دیکھئے صاحب میں اس بات سے بے حد چڑھتا ہوں کہ میاں بیوی آپس میں ایک دوسرے کی جا اور بے جا طرفداری کر کے ایک تیسرے آدمی کو خواہ مخواہ بیوقوف بنا دیں۔ بات ہونا چاہیے ایمانداری کی اور ایمان کی بات یہ ہے کہ باہر سے آنے والے اس اجنبی ملک میں اپنے لیے کیونکر کوئی صورت پیدا کر سکتے ہیں۔''

خلیق : ''جب تک وہ خود اجنبیت کو دور نہ کریں گے برابر اجنبی بنے رہیں گے۔ آخر وہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اب تو یہیں رہنا سہنا ہے۔ یہاں کے لوگوں کو اپنا مزاج شناس بنائیں۔ ان کے اداشناس خود بنیں۔ صوبجاتی فرق کو بھولیں۔ مقامی تعصبات کو چھوڑیں اُن سے گھل مل کر اور ان کو اپنا کر رہیں۔''

قاضی جی : ''ارے صاحب ذرا دم تو لیجیے۔ آپ تو خدا جانے کیا کیا فرما گئے۔ بندہ پرور اگر ہم آپ سر بھی پٹخ ماریں تو وہ بات اپنی طرف والی یہاں پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ اب ایک معمولی سی بات ہے انگرکھے میرے سب جواب دے گئے ہیں۔ اب میں کہاں سے لاؤں گا میاں عاشق

حسین کو یہاں انگرکھا سینے کے لیے۔‘‘

خلیق : ’تو نہ پہنیے انگرکھا۔ کوئی انگرکھا پہننا مذہبی فریضہ تو ہے نہیں۔‘‘

قاضی جی : ’’چہ خوش۔ کیا خوب فرمایا آپ نے انگرکھا نہ پہنیے اور نہیں تو کیا شلوار پہنوں اور غبارہ بنا ہوا پھروں۔ حشت مجھ سے تو یہ ہو نہیں سکتا۔ راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے اسی خیال سے کہ اب کون آڑے پاجامے کی لہریا تراش کے کمالات دکھائے گا۔ کون جالی کھول کر جوے بنائے گا۔ کرتے کڑھوانے کے لیے اب گویا ترس ترس کے رہنا پڑے گا۔ خیر کچھ بھی ہو۔ مگر میرے لیے یہ تو ممکن ہی نہیں کہ میں شلوار پہن کر غبارہ بن جاؤں۔‘‘

خلیق : ’’خیر آپ شلوار پہن کر غبارہ بنیں یا انگرکھا پہن کر کنکوا۔ مگر رہنا اب یہیں ہے اور یہاں رہنے کے سلسلہ میں جن باتوں پر واقعی غور کرنا ہے۔ وہ ان شلوار اور انگرکھے کے مسائل سے زیادہ اہم ہیں اور ان پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔‘‘

(محمود داخل ہوتا ہے)

’’اخاہ محمود میاں۔ یہ آپ یہاں کیسے؟‘‘

محمود : ’’مجھے تو آئے ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا۔ آپ کیا ابھی تشریف لائے؟‘‘

قاضی جی : ’’ارے صاحب آپ لائے بھی کوئی ہری ترکاری۔ یہ کیا؟ گاجر۔ سبحان اللہ! صاحب یہ تو اودی ترکاری ہے۔ اور ہونا یہ چاہیے کہ میت میں اگر کوئی جائے تو کوئی سبز چیز لے کر گھر آنا چاہیے۔ آپ نے شگون کا رنگ ہی بدل دیا۔ سبز غالباً اودے کو نہیں کہتے یعنی آپ اتنے

بڑے ہو گئے اور ایک سبز اور اودے کا فرق معلوم نہیں ہوا۔ میں جب آپ کی عمر کا تھا اُس وقت میری شاعری کی دھوم تھی اور ایک آج کل کے لڑکے ہیں کہ ان کو سبز اور اودے کی تمیز نہیں۔ معلوم نہیں جس وقت عقل تقسیم ہو رہی تھی اس وقت جناب کہاں تشریف رکھتے تھے۔‘‘

بیوی : ’’بیکار کو بات کا بتنگڑ کر دیتے ہو۔ اوّل تو یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ دوسرے مطلب تھا ترکاری سے وہ پورا ہو گیا۔ پھر یہ کہ تم تو آ ہی چکے تھے خالی ہاتھ۔‘‘

خلیق : ’’اچھا صاحب محمود میاں کے آجانے سے ایک مسئلہ تو حل ہو گیا کہ تمباکو اب وہی مل جائے گی جس کے ہم لوگ عادی ہیں۔‘‘

قاضی جی : ’’ناممکن۔ قطعاً ناممکن۔ ان حضرت کی عقلمندی کا میں کچھ ایسا معتقد ہو چکا ہوں کہ مجھ کو ان سے نہ تمباکو کی اُمید ہے نہ اور کسی سلیقہ کے کام کی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ وہاں کیوں کر اپنا کاروبار پھیلائے ہوئے تھے۔‘‘

خلیق : ’’اچھا صاحب ایک بات تو بتائیے۔ شیخ صاحب مرحوم کے انتقال کے سلسلہ میں خیال آیا کہ وہ اپنے یہاں کی طرح نہ یہاں دوکانیں ہیں نہ کراچی میں۔ جیسے اپنے یہاں تجہیز و تکفین کے جملہ سامان کی دوکانیں ہوتی ہیں۔ جو دن رات کھلی رہتی ہیں اور ایک ہی جگہ کفن سے لے کر چھوٹی مٹی تک سب ہی کچھ مل جاتا ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’استغفر اللہ۔ بمشکل تمام یہ ذکر کمبخت ختم ہوا تھا کہ گھوم پھر کر جناب پھر اسی منحوس قصہ کو لے بیٹھے۔ جہنم میں گئیں وہ دکانیں۔ میں تو ان سڑکوں کا راستہ تک نہ چلتا تھا جہاں یہ منحوس دوکانیں تھیں۔ بھلا غور تو

کیجیے کہ کمبختوں کو کاروبار بھی سوجھا تو موت کا یعنی جتنے لوگ زیادہ مریں اتنا ہی ان کا کام چلے۔ وہ کمبخت دعائیں مانگتے ہونگے لوگوں کے مرنے کی۔"

خلیق : "وہ جو کچھ بھی ہو مگر وہ دوکانیں ہوتی بے حد ضروری ہیں۔ یعنی ایک ہی جگہ پر تمام چیزیں موجود۔ آدمی ایک ایک چیز کے لیے دربدر مارا مارا تو نہ پھرے۔ کافور، چٹائیاں، ملتانی مٹی، روئی، عطرِ گل۔"

قاضی جی : "صاحب خدا کے لیے اب میرے حال پر رحم فرمایئے۔ یعنی مجھکو خفقان ہوتا ہے اس ذکر سے۔ ایک تو آج رہ رہ کر آنکھوں کے سامنے اُن حضرت کی تصویر آجاتی ہے۔ لاکھ دھیان بٹاتا ہوں ادھر اُدھر کے خیالات لاتا ہوں۔ مگر معلوم ہوتا ہے شیخ صاحب کھیسیں نکالے کھڑے ہیں۔ بھئی میں نے کہا سنتی ہو اپنی اور محمود کی چارپائی کے درمیان آج میری چارپائی رکھنا اور کچھ پڑھ کر دم بھی کر دینا......"

خلیق : "کمال کرتے ہیں آپ بھی بھائی جان۔ موت بھی کوئی ڈرنے کی چیز ہے سب ہی کو ایک دن۔"

قاضی جی : "ہاں ہاں صاحب وہ میں جانتا ہوں۔ اب اُس کو بار بار کہنے کی ضرورت نہیں۔ رہ گیا ڈرنا تو ڈرتا ورتا تو خیر میں کیا البتہ اس ذکر سے کچھ وحشت سی ضرور ہوتی ہے۔ ارے صاحب اسی لیے تو آج میں وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اب وہاں جاکر رونا پیٹنا سن کر آیا ہوں۔ تمام یہ سامان پھیلا ہوا دیکھ آیا ہوں تو حال یہ ہے کہ ہر طرف بس شیخ صاحب ہی شیخ صاحب نظر آرہے ہیں۔ اور آپ لوگ ہیں کہ اس خیال کو بھولنے بھی نہیں دیتے۔ کوئی پوچھے کہ بھلا اس وقت اُن

نامراد دوکانوں کو یاد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

خلیق : "نہیں صاحب تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں جو سہولتیں وہاں تھیں وہ یہاں ہرگز نہیں ہیں۔ انجمن کے دفتر میں اطلاع کرا دیجئے کہ موت ہوگئی ہے بس پھر کوئی فکر نہیں۔ قبرستان میں قبر، پڑے۔ گھڑے۔"

قاضی جی : "صاحب آپ کیا جان لے کر رہیں گے آخر۔ ارادہ کیا ہے؟ میں اول تو اختلاجی آدمی۔ دوسرے یہ بھی عجیب اتفاق کہ نزلے اور حرارت میں مبتلا ہوں اور کچھ اسی قسم کی شکائتیں میری جان سے دور، ان حضرت کو بھی تھیں۔ اس سے اور بھی طبعیت پریشان ہے اوپر سے آپ ہیں کہ قبر اور تختوں تک کا ذکر چھیڑ رکھا ہے۔"

بیوی : "خلیق میاں واقعی اب اور باتیں کرو۔"

خلیق : "بھابی جان میں مذاق میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ بلکہ میرا مطلب یہ تھ کہ ہم کو اب یہاں رہنا ہے اور اس کو اپنا گھر سمجھ کر رہنا ہے تو ضرورت اس کی ہے کہ جو باتیں اپنے نزدیک آرام اور آسائش کی ہم وہاں چھوڑ آئے ہیں آخر کیوں نہ ان کو یہاں پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر وہ چیزیں اچھی تھیں تو یہاں بھی ہونا چاہئیں۔"

قاضی جی : "ضرور ہونا چاہئیں۔ اس ذکر پر میں کب بُرا مانا تھا میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ کسی طرح وہ منحوس ذکر ختم کیا جائے۔"

خلیق : "میں اسی سلسلہ میں عرض کر رہا تھا کہ میرے نزدیک وہ تجہیز و تکفین کی دوکانیں یہاں بھی کھلنا چاہئیں اور قبرستان کی وہ سہولتیں یہاں بھی مہیا کی جائیں۔"

قاضی جی : "اچھا صاحب اچھا۔ گویا مطلب یہ ہے کہ یہ میری چڑھ مقرر کی گئی

ہے۔ اگر یہ مذاق ہے تو نہایت بے ہودہ مذاق اور اگر جناب یہ ذکر سنجیدگی سے کر رہے ہیں تو لعنت ہے اِس سنجیدگی پر۔ میں خود ہی یہاں سے دفعان ہو جاؤں تو اچھا ہے۔ یعنی اِس سنگدلی کی بھی کیا انتہا ہے کہ ایک شخص کی جان پر اِس تذکرے سے بنی ہوتی ہے اور جناب ہیں کہ۔ کہ۔ بس اب میں کیا کہوں۔‘‘

زبیدہ : ‘‘یعنی واقعی آپ کوئی اور بات کیوں نہیں کرتے۔’’

قاضی جی : ‘‘اجی کریں یا نہ کریں۔ میں خود ہٹا جاتا ہوں یہاں سے۔ مگر میں نے کہا سنتی ہو، تم تو چلو میرے ساتھ ورنہ تنہائی میں تو اور بھی اختلاج کا دورہ پڑ جائیگا۔’’

خلیق : ‘‘نہیں آپ تشریف رکھئے میں اب کچھ نہ کہوں گا۔’’

قاضی جی : ‘‘اب تشریف رکھنے والے پر تھو۔ آپ شوق سے یہی ذکر کیجیے۔ بڑا شوق ہے تو یہ دوکان بھی خود ہی کھول لیجیے۔ قبرستان کی انجمن بنا کر اس کے صدر بن جایئے۔ مگر میرا دل ایسا مضبوط نہیں ہے کہ میں جناب سے یہی باتیں بیٹھ کر سنتا رہوں۔ سوچا تھا کہ آج یہ واقعہ ہوگیا ہے تو قسمت سے یہ آگئے ہیں۔ ذرا چہل پہل رہے گی، دم نہ الجھے گا، وحشت نہ ہوگی مگر وہی مثل کہ...... خیر ہوگی کوئی مثل نہ یاد آئے وہ کمبخت بھی۔ اب آپ یہیں بیٹھی رہیں گی یا چلتی ہیں اپنے کمرے میں؟’’

بیوی : ‘‘توبہ ہے چل تو رہی ہوں۔’’

قاضی جی : ‘‘آؤ بھئی محمود میاں آج میں تم کو اپنا کچھ کلام ہی سنا دوں تم ادب کی وجہ سے نہ کہتے ہوگے۔ مگر سننے کو دل ضرور چاہتا ہوگا۔ وہ سیاہ رنگ کی

بیاض میز پر سے اٹھاتے لاؤ۔ مگر نہیں۔ چھوڑو اس کو ایک آدھ غزل اُن ہی حضرت کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ صاحب ناک میں دم کر دیا ہے ان شیخ صاحب مرحوم نے۔ کسی طرح دماغ سے نکلتے ہی نہیں۔ میں نے کہا خدا کے لیے کچھ پڑھ کر مجھ پر دم کر دو۔ جوں جوں دن ڈوب رہا ہے طبیعت کی وحشت بڑھ رہی ہے۔ بحرحال یہاں سے تو چلو ورنہ پھر۔’’

خلیق : ‘‘نہیں اب آپ تشریف رکھئے میں کچھ نہ کہوں گا۔’’

قاضی جی : ‘‘جی بس بخشئے۔ بلکہ بخشیں بی بلّی چوہا لنڈورہ ہی بھلا۔ آپ سے جس حسن سلوک کی امید تھی وہ پوری ہو چکی۔ اب بس یہی کسر باقی ہے کہ میں اختلاج میں مبتلا ہو کر گر پڑوں تا کہ کسی کی جان جائے اور آپ کی ادا ٹھہرے۔ میرا آپ کا رشتہ مذاق کا ضرور ہے مگر یہ مذاق تھوڑی ہے۔ جلّادی ہے، سفا کی ہے، قصائی پن ہے بلکہ بقر قصابی ہے۔ اور بنتے ہیں بڑے پڑھے لکھے عالم فاضل ایم.اے. پاس شش۔’’

(۱۲)

(قاضی جی گھر میں داخل ہوتے ہیں)

قاضی جی : ''ارے بھئی زبیدہ۔ یہ آخر تم دونوں کہاں ہو نند بھاوج۔ یہ گھر ہے صاحب ہمارا کہ کوئی پرسان حال نہیں۔''

زبیدہ : ''(دور سے) اسی طرف آجایئے ہم لوگ یہاں ہیں کوٹھے پر۔''

قاضی جی : ''یہاں ہیں اور وہاں ہیں۔ دروازے پر ٹائم ٹیبل ہی ٹانگ دیا کریں کہ اس وقت سے اس وقت تک یہاں نیاز حاصل ہو سکتا ہے۔ اس وقت سے اس وقت تک وہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔ اب معلوم نہیں اس وقت کوٹھے پر پتنگ بازی ہو رہی ہے یا ڈور لوٹنے کے لیے دونوں اوپر پہنچ گئی ہیں (بلند آواز سے) ارے صاحب میری ٹانگوں میں درد ہے خدا کے لیے میری بات آکر سن جایئے۔''

بیوی : ''(دور سے) کوّے روٹی اٹھا لے جائیں گے۔''

قاضی جی : ''کوّے روٹی اٹھا لے جائیں گے؟ یہ کیا بات ہوئی۔ اچھا میں خود آرہا ہوں۔ کوّے۔ روٹی۔ کوّے (جاتے ہیں)

زبیدہ : ''میں تو آرہی تھی بات سننے پھر آپ کیوں آنے لگے کوٹھے پر۔''

قاضی جی : ''اب تو صاحب میں یہ دیکھنے جا رہا ہوں کہ آخر ہو کیا رہا ہے کوٹھے پر اور یہ کوّے روٹی لے جائیں گے والی بات آخر کیا تھی۔ روٹی کے ساتھ دال سالن کباب وغیرہ کا نام اکثر سنا تھا مگر کوّے کا نام آج ہی سننے میں آیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ روٹی اور کوّے کا کون سا جوڑ ہے۔''

زبیدہ : ''بھائی جان چھت پر روٹی سکھانے کے لیے پھیلائی گئی ہے۔ اور اگر وہاں سے ہم لوگ ہٹ آئیں تو ڈر ہے کہ کوّے آکر لے جائیں گے۔''

قاضی جی : ''یہ یہ آج پتہ چلا ہے کہ مجھ کو کھانا کھانے کے وقت جبڑیوں کی جو ورزش کرنا پڑتی ہے اس کی وجہ کیا ہے۔ یعنی مجھ کو دھوپ میں سکھا سکھا کر روٹیاں کھلائی جاتی ہیں۔ اصلی دانت تو خیر ان ہی روٹیوں کے نذر ہو ہی چکے ہیں۔ مگر نقلی دانتوں سے بھی نوالہ چبانے کے وقت کلہاڑی کا کام لینا پڑتا ہے۔''

بیوی : ''(آتے ہوئے) کس کو کلہاڑی کا کام لینا پڑتا ہے۔''

قاضی جی : ''اپنا ہی ذکر کر رہا تھا کہ مجھ کو گویا اس طرح سکھا سکھا کر روٹیاں زہر مار کرائی جاتی ہیں۔ اس کا پتہ تو آج ہی چلا یعنی آگ پر پکانا کافی نہیں ہوتا دھوپ میں سکھانے کی بھی ضرورت پیش آتی ہے روٹیوں کے لیے۔''

بیوی : ''لو اور سنو، تو کیا تم کو کھلانے کے لیے یہ روٹیاں سکھائی گئی ہیں۔''

قاضی جی : ''تو مجھ کو کیا معلوم کہ مجھ کو آگ پر پکی ہوئی روٹیاں ملتی ہیں اور آپ لوگ دھوپ کی سکی ہوئی روٹیاں نوش فرماتے ہیں۔ میں نے تو آج تک روٹی پکانے کی یہ ترکیب ہی کسی سے نہیں سنی کہ عین دوپہر کے وقت کوٹھے پر چڑھ روٹیاں پکا پکا کر دھوپ میں سینکی جا رہی ہیں۔

سبحان اللہ۔ اس گھر کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔''

زبیدہ : ''بھائی جان کیا سچ مچ آپ نے دھوپ میں روٹیاں سکھاتے ہوئے کبھی کسی کو نہیں دیکھا۔''

قاضی جی : ''نہ میرے خاندان میں اب تک کوئی ایسا پاگل گذرا ہے کہ دھوپ میں روٹیاں پکانا شروع کر دے، نہ میری بیویوں میں سے کسی کے پاس زنانے رسالے آیا کرتے تھے جن میں اس قسم کی ترکیبیں چھپا کرتی ہیں۔ چھاپ دی ہوگی کسی رسالے نے دھوپ میں روٹی پکانے کی ترکیب، بس بیگم صاحبہ تو ٹھیریں ان رسالوں کی مرید پہونچ گئیں تجربے کرنے۔ کوئی پوچھے کہ بال بڑھانے کے سینکڑوں تجربے کر کے آپ نے کیا پایا۔ چوٹی کی جگہ وہی چھپکلی کی دم لٹک رہی ہے۔ پیسے کی ستیاناسی اور وقت کی بربادی۔''

بیوی : ''خدا کے لیے زبیدہ بہن ان کو دکھا دو کہ کس قسم کی روٹیاں سکھائی جاتی ہیں۔ میں پوچھتی ہوں تم نے کبھی ٹکڑے کھائے ہیں یا نہیں۔''

قاضی جی : ''کیا خوب، گویا اب آپ لقمان سے بھی یہ پوچھ سکتی ہیں کہ تم نے حکمت پڑھی ہے یا نہیں۔ ارے صاحب ہمارا خاندان آخر مٹا کس شوق میں۔ اسی کھانے پینے میں۔ پستے بادام کی کھچڑی۔ مشکی پلاؤ۔ موتیا پلاؤ، دودھ کی پوریاں، سلطانی دال، بھٹے کا رائتہ مختصر یہ کہ کہاں تک گنواؤں۔ ایسے ایسے عجائب خانے کھائے بیٹھا ہوں کہ آپ نے ان کھانوں کا نام بھی نہ سنا ہوگا اور مجھ سے دریافت فرماتی ہیں گویا مجھ سے پوچھتی ہیں کہ ٹکڑے کھائے ہیں کبھی۔ ٹکڑے سیکڑوں قسم کے ہوتے ہیں۔ شیرمال کے ٹکڑے، نان پاؤ یعنی ڈبل روٹی کے ٹکڑے، شاہی ٹکڑے، سلطانی ٹکڑے، زعفرانی ٹکڑے۔ صاحب میں تو ان ہی ٹکڑوں پر پلا ہوں معلوم نہیں آپ کن ٹکڑوں کو پوچھ رہی ہیں۔''

زبیدہ : ''بھابی جان کا مطلب ہے باسی ٹکڑوں سے۔''

بیوی : ''اے یہ دیکھو ان ٹکڑوں کو بھی پکوا کر کھایا ہے کبھی؟''

قاضی جی : ''کیا مطلب؟ یعنی یہ جو دستر خوان پر ٹوٹی ہوئی روٹیاں اور نوالے وغیرہ جو بچ جاتے ہیں ان کو جمع کیا گیا ہے۔ بھئی یہ کیا نحوست ہے۔ یعنی یہ ٹکڑگدا پن بھی اب میرے گھر میں ہونے لگا ہے۔ کمال ہے صاحب ہفتوں اور مہینوں کی سوکھی روٹیوں کا ایک انبار جمع کر رکھا ہے ان عورتوں نے۔ آخر یہ آخور ہوگا کیا؟''

بیوی : ''یہ سب پکا لیے جائیں گے اور جب پک جائیں تو دیکھنا کیسے مزے کے ہوتے ہیں۔''

قاضی جی : ''اجی خدا نہ کرے میں کھاؤں ان کو۔ مگر سوال تو یہ ہے یہ رنگ برنگ ٹکڑے تم نے جمع کہاں سے کئے؟ میں تو کبھی نصیب دشمناں بھیک مانگنے بھی نہیں گیا کہ فقیروں کی طرح میرے گھر میں ان سوکھے ٹکڑوں کا یہ انبار جمع ہو گیا۔ یہ تو بالکل دردر اور گھر گھر مانگنے والوں کا طریقہ ہے کہ وہ جھولی میں روٹیاں بھر بھر کر لاتے ہیں اور اس طرح سکھا سکھا کر رکھتے رہتے ہیں تاکہ اگر کسی دن کچھ نہ ملے تو ان ہی کو نمک یا گڑ میں پکا کر کھا لیں۔''

زبیدہ : ''تو کیا آپ نے کبھی چکھے بھی نہیں یہ ٹکڑے؟''

قاضی جی : ''اے صاحب خدا نہ کرے مجھ پر یہ وقت پڑا ہو کبھی اور نہ میں اب یہ فقیرا پن ہونے دونگا اپنے گھر میں۔ جو سنے وہ بھی کیا کہے کہ خدا

جانے بیچارے قاضی جی پر کیا وقت آپڑا ہے کہ سوکھی ہوئی روٹیوں کے ٹکڑے پکوا پکوا کر گھر بھر کو کھلاتے اور خود کھاتے ہیں۔ یہ بات کسی کو بھی معلوم نہ ہوگی کہ اس میں قاضی جی کمبخت کا کوئی قصور نہیں۔ یہ چھوٹی باتیں بیگم صاحبہ اور ہمشیرہ صاحبہ محض اس کمبخت بڈھے کو، خیر بڈھا تو کیا مگر ادھیڑ عمر کے انسان کو بدنام کرنے کے لیے کی جاتی ہیں تاکہ وہ بدنام ہو۔ ذلیل ہو۔ دنیا اس پر تھوکے اس کی ناک کٹے اور اور اور۔ اسی قسم کی اور باتیں ہوں۔‘‘

بیوی : ’’سچ مچ مجھ کو تو یہ ٹکڑے نمکین بھی پسند ہیں اور میٹھے بھی۔‘‘

زبیدہ : ’’مجھ کو نمکین زیادہ پسند ہیں عمدہ گھی ہو اور ہرے دھنیے کی چٹنی پھر دیکھیے ان کا لطف۔‘‘

قاضی جی : ’’ارے صاحب مجھ کو نمکین اور میٹھے دونوں قبول نہیں۔ مہربانی فرما کر اس انبار کو پھنکوائیے کہیں۔ یعنی یہ کنجوسی بھی نہیں بلکہ نحوست کی انتہا ہے۔ اور پھر مزے لے کر آپ لوگ ذکر اس طرح کر رہے ہیں کہ جیسے خدا جانے کتنے فاقوں کے بعد یہ ٹکڑے میسر آئے ہوں۔ غضب خدا کا! یہ باتیں اس خاندان میں ہو رہی ہیں جس کے پلے ہوئے کتے بلیوں کو بھی یہ ٹکڑے کبھی نہیں دیئے گئے۔ خدا جنت نصیب کرے ابا جان کے بلے کو...... یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ خدا بخشے ابا جان کو ان کا ایک بلا تھا پالو۔ اس کے لیے روزانہ ڈبل روٹی اور دودھ آیا کرتا تھا دونوں وقت۔ اور کیا مجال کہ وہ کسی کے سامنے کا جھوٹا ایک نوالہ تو کھالے۔ اب ان کی اولاد کا یہ حال ہے کہ سوکھی ہوئی روٹیاں جمع کرتی پھرتی ہیں آپ۔ ارے بھئی پھنکوا دو اس کو۔‘‘

بیوی : ’’واہ پھنکوانے کی بھی ایک ہی رہی۔ رزق ہے مجھ سے تو یہ ناقدری ہو نہیں سکتی۔ یہ وقت رزق کی بربادی کا نہیں ہے۔ اپنے پاکستان کے غلہ کا ایک ایک دانہ قیمتی ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’لیجیے صاحب۔ پاکستان سوکھی روٹیوں کے اس ڈھیر سے بھی نکل آیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان آپ لوگوں کا تکیہ کلام ہے یا آپ لوگوں نے میری چڑھ مقرر کر رکھی ہے۔ آخر اس وقت پاکستان کا کیا ذکر تھا جو آپ جھٹ سے پاکستان کا ذکر لے دوڑیں۔ گویا اب پاکستان نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ یہ سوکھے ٹکڑے جمع کیا کرو۔‘‘

زبیدہ : بات یہ ہے بھائی جان کہ اب تو ہم کو ہر بات میں اپنے پاکستان کا خیال رکھنا ہی پڑے گا۔ پاکستان ہی کے فائدے سے ہمارا فائدہ اور اسی کے نقصان سے ہمارا نقصان ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’استغفر اللہ۔ کون مردود کہہ رہا ہے کہ آپ اپنے پاکستان کا خیال نہ رکھیے۔ مگر یہاں تو اس وقت ذکر تھا ان سوکھی روٹیوں کا۔ آخر ان میں پاکستان کیونکر گھس گیا۔ ہر بات موقع محل سے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ پاکستان کے معاملہ میں تو میں خود نہیں بولتا۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جس معاملہ میں بھی میں نے ذرا دخل دیا وہ گھوم پھر کر پاکستان کا معاملہ بن جاتا ہے۔ قسم لے لو جو میرے فرشتوں کو بھی اس بات کا وہم ہو کہ سوکھی روٹیوں کے اس ڈھیر کے اندر بھی پاکستان صاحب تشریف فرما ہیں۔ آخر اس وقت پاکستان کا کیا ذکر تھا۔‘‘

بیوی : ’’پاکستان کا ذکر یہ تھا کہ پاکستان کا غلہ ایسا فالتو نہیں ہے کہ اس کو اس طرح برباد کیا جائے۔ ہم کو چاہیے کہ دانے دانے کی قدر کریں۔ خود

احتیاط سے کھائیں اور دوسروں کے لیے بچائیں۔ پھر یہ کہ جن سوکھے ٹکڑوں کی آپ یہ ناقدری کر رہے ہیں ان ہی کو سلیقہ کے ساتھ نہایت مزیدار طریقہ پر پکایا جا سکتا ہے۔ اور مجھ کو واقعی یہ ٹکڑے بے حد پسند ہیں۔ میں تو ان کی ناقدری نہیں کر سکتی۔‘‘

قاضی جی : ’’اچھا صاحب اگر یہ پاکستان کا غلہ ہے تو میں بھی پاکستان کا ایک انسان ہوں بلکہ پاکستان کی ایک عورت کا پاکستانی شوہر ہوں۔ آپ میری بھی ناقدری نہیں کر سکتیں اور میری بے عزتی کا آپ کو گویا کوئی حق نہیں پہونچتا۔ آپ کے ان ٹکڑوں کے جمع کرنے اور کنگلوں کی طرح پکانے میں میری بے عزتی ہوتی ہے۔ کیا سمجھیں آپ؟‘‘

زبیدہ : ’’بھائی جان اس میں آخر بے عزتی کی خدانخواستہ کیا بات ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ آپ کو ناپسند ہیں آپ نہ کھایئے گا۔ چلیے چھٹی ہوئی۔‘‘

قاضی جی : ’’چھٹی کیسے ہوگی صاحب۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے لاکھ کا گھر خاک کر ڈالا مگر وضعداری میں فرق نہ آنے دیا۔ ہمارے دسترخوان کی جو شہرت دور دور ہو چکی تھی اس پر بٹہ کبھی نہ لگنے دیا۔ ہمارے یہاں کے دیگ شو۔ باورچی اور رکابدار بھی وہ کھانا نہ کھاتے ہوں گے جو ہم لوگ اب کھاتے ہیں۔ باپ دادا کا ذکر نہیں خود میں نے اپنے بچپن میں دادا جان کے دسترخوان پر ایک ہی وقت میں دس بارہ قسم کے تو محض پلاؤ کھائے ہیں۔ اب خدا کی شان کہ ہمارے خاصے کے لیے یہ ٹکڑے جمع ہونے لگے ہیں۔‘‘

بیوی : ’’توبہ ہے! یہ کسی غربت کی وجہ سے جمع نہیں کئے گئے۔ بلکہ ایک تو اچھے لگتے ہیں مجھ کو بھی شوق ہے زبیدہ بہن کو بھی شوق ہے۔ دوسرے

رزق کی بربادی کتنی بری بات ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’اسی کو کہتے ہیں کنگلا پن۔ یہی کہلاتی ہے کنجوسی۔ اگر اسی طرح دانے دانے پر تم نے نظر رکھی تو ہر طرف منحوس مشہور ہو جاؤ گی۔ صبح کے وقت کوئی نام نہ لے گا اور جو نام لے گا اس کو دن بھر کھانا نصیب نہ ہوگا۔ ذرا غور کیجیے کہ اس گئی گذری حالت میں بھی میں نے کھانے پینے کی چیزوں کے سلسلہ میں کبھی نہیں ترسایا ہے۔ ایک سے ایک نعمت تمہارے لیے ہمیشہ موجود رہی۔ پھر بھی نیت کا یہ حال ہے کہ روٹی کے سوکھے ٹکڑے بٹورتی پھرتی ہو۔ ارے بھئی ٹکڑوں کا شوق ہے تو آج ہی لو شاہی ٹکڑے دسترخوان پر موجود ہوں گے۔‘‘

بیوی : ’’خدا کے لیے بات سمجھ لیا کرو۔ شاہی ٹکڑوں کا ہرگز انتظام نہ کرنا۔ ان ٹکڑوں کے لیے جب جی چاہے گا تو وہ بھی بن جائیں گے۔ فی الحال تو ان ٹکڑوں کو دل چاہ رہا ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’لاحول ولاقوۃ۔ خدا کے لیے ان ٹکڑوں کا ذکر چھوڑ دو اور مجھ پر بلکہ میرے باپ دادا کی روح پر احسان کرو کہ یہ جو تم نے بھک منگوں کی سی بات کر کے میرے وضعدار بزرگوں کی روح کو دوسرے رئیسوں کی روح کے سامنے شرمندہ کیا ہوگا اس کا بدلہ کوئی بہت بڑی بات کر کے دو مثلاً۔ مثلاً آج واقعی شاہی ٹکڑوں کی رہے۔‘‘

زبیدہ : ’’بھائی جان بھلا غور تو کیجیے کہ یہ وقت ان باتوں کا ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’اتنی دیر ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا نتیجہ ہی یہ تھا کہ میرا دل آخر چاہنے لگے۔ تمام پرانے دسترخوان نگاہوں کے سامنے پھر گئے۔ اور ہر قسم کے ٹکڑوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ مگر ان ٹکڑوں کو سب سے

"پہلے پھنکوایا جائے گا۔"

بیوی : "بیکار کی ضد اس عمر میں اچھی نہیں لگتی۔ میں تو ہرگز اناج کو پھینکنے نہ دوں گی۔"

قاضی جی : "بس تو پھر قصہ ختم۔ ان کمبخت ٹکڑوں کے پیچھے آج عمر کا طعنہ بھی سن لیا۔ اس بڑھاپے پر خدا کی مار جس نے آج اس طرح اپنی ہی بلی سے میاؤں کہلوایا ہے۔ اب چاہے ہوٹل میں شاہی ٹکڑے زہر مار کرلوں مگر اس گھر کا رخ نہ کروں گا۔ بھر پایا صاحب۔ اپنی عزت اپنے ہی ہاتھ ہے۔ خدا دشمنوں کو بھی بیوی کے منہ سے بڈھا نہ کہلوائے۔ واہ ری تقدیر ہماری۔ آخ تھو۔"

(۱۴)

(قاضی جی تشریف لاتے ہیں)

قاضی جی : "ارے بھئی ذرا دیکھنا۔ میں نے کہا، ایک گھوڑے کا پتہ نہیں چل رہا ہے۔"

بیوی : "گھوڑے کا پتہ نہیں چل رہا ہے۔ گھوڑا کیسا؟"

قاضی جی : "اب گویا میں جلدی میں آپ کو یہ سمجھانے بیٹھ جاؤں کہ گھوڑا کیسا ہوتا ہے۔ ارے صاحب وہ دلکی چلنے والے گھوڑے کا ذکر نہیں ہے، میں شطرنج کے گھوڑے کا ذکر کر رہا ہوں۔ سفید مہرے تو سب موجود ہیں کالے گھوڑے کا پتہ نہیں، خدا جانے بساط کے اندر ہی اند کہاں غائب ہوگیا۔"

جمیلہ : "تسلیم دولھا بھائی۔"

قاضی جی : "یاد کر رہا ہوں کہ کہاں غائب ہوسکتا ہے۔ برسوں کے بعد تو آج شطرنج یاد آئی ہے۔ اب ذہن میں نہیں آتا کہ یہ تین گھوڑوں والی شطرنج کون سی ہوسکتی ہے۔"

زبیدہ : "بھائی جان، جمیلہ آپا سلام کر رہی ہیں آپ کو، جواب تو دیدیجئے۔"

قاضی جی : "وہ تو خیر ٹھیک ہے۔ مگر یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ شروع سے تین ہی گھوڑے ہوں۔ یقیناً ایک مہرہ کہیں کھویا ہے۔ یہ گھر تھوڑی ہے

ہمارا۔ آسیب خانہ ہے آسیب خانہ کہ چیز رکھی اور غائب۔ بلکہ آسیب بھی شطرنج کا مہرہ کیا کرتے لے جا کر۔ وہ تو اس لیے غائب کیا گیا ہوگا کہ میرے شوق کی ایک چیز ہے لہٰذا اس کو تباہ کیا جائے تا کہ مجھ کو تکلیف ہو۔ میری دل آزاری ہو۔ میری۔ میری۔ میری۔ یعنی۔ یعنی اخاہ۔ ارے بھئی تم۔ یعنی تم کب آئیں جمیلہ؟''

جمیلہ : ''میں تو بڑی دیر سے سلام کر رہی ہوں۔ آپ کا شطرنج کا گھوڑا کیا کھویا کہ آپ جیسے خود کھوئے کھوئے سے ہیں۔''

بیوی : ''آج نہ جانے شطرنج نگوڑ ماری کیوں یاد آ گئی ہے۔''

قاضی جی : ''یاد یوں آ گئی ہے صاحب کہ آج اتفاق سے چھٹن خاں مل گئے تھے بازار میں۔ بہت دبلے ہو گئے ہیں بیچارے۔ اور تم بھی بہت دبلی ہو گئی ہو جمیلہ۔ دیکھو تو کسی پاندان کی ڈبیا کلہیا وغیرہ میں تو نہیں پڑا ہے گھوڑا۔ اور ہاں آج بھئی زبیدہ تمہاری کاریگری دیکھنا ہے کہ پانوں کا کیسا تانتا باندھتی ہو تم۔ شطرنج کے کھیل کا مزہ بس اسی میں ہے کہ حقہ چلتا رہے اور خاصدان خالی نہ ہونے پائے۔''

بیوی : ''کسی بات کا بھی کوئی سر پیر ہے۔''

جمیلہ : ''چھٹن خاں کے دبلاپے سے میرا دبلا ہونا یاد آ گیا۔''

قاضی جی : ''صاحب بات یہ ہے کہ چھٹن خاں آتے ہوں گے اور یہاں اب تک ایک گھوڑا ہی غائب ہے۔ کھیلوں گا کیا شطرنج اپنا سر؟ مدتوں کے بعد آج سوچا تھا کہ ذرا بازی جمے گی۔ چھٹن خاں کو بڑی مشکل سے گھیرا ہے وہ کمبخت بھی رسیاں تڑا رہا تھا کہ بیوی بیمار ہیں۔ آخر جب بہت تاؤ دلایا تو بس دو داد دینے گھر گیا ہے آتا ہی ہوگا۔''

بیوی : ''اتنے دنوں سے امن تھا کہ جب سے یہ آفت قیامت آئی ہے یہ موئی شطرنج کی پھڑ یہاں جمنے نہ پاتی تھی۔ سب تتر بتر ہو گئے تھے اب یہ نحوست پھر شروع ہو رہی ہے۔ اللہ جانے اس موئی شطرنج میں کیا مزہ ہے۔''

قاضی جی : ''صاحب مزہ یہ ہے کہ میں کمبخت بھی آخر کسی طرح دل بہلاؤں یا نہ بہلاؤں۔ وقت کمبخت کسی طرح کاٹے نہیں کٹتا۔ کوئی آخر کہاں تک بیٹھا اونگھتا رہے۔ شطرنج میں سو خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ وقت جو پہاڑ کی طرح کاٹے نہیں کٹتا پانی کی طرح بہہ جاتا ہے۔ پتہ نہیں چلتا کہ وقت ہے بھی کوئی چیز۔''

زبیدہ : ''لیجیے اور سنئے۔ وقت گویا ایسی بیکار اور فالتو چیز ہے۔''

جمیلہ : ''کیا خوب وقت کی قیمت آپ نے لگائی ہے دولھا بھائی۔''

قاضی جی : ''وقت کی قیمت؟ وقت کیا چیز ہوتی ہے۔ وقت دکھانے کی ایک مشین تو میں نے سنی تھی جس کو گھڑی کہتے ہیں۔ اور وہ بیشک ایک سے ایک قیمتی ہوتی ہے مگر وقت کی قیمت آج آپ ہی سے سنی۔ ہماری سسرال بھی صاحب عجیب و غریب عقل مندوں سے پٹی پڑی ہے۔ ایک سے ایک افلاطون اور بقراط لے لیجیے۔ اب یہ تشریف لائی ہیں ہمشیرۂ نسبتی وقت کی قیمت بتانے والی۔ کیوں صاحب آج کل آپ کے یہاں وقت کتنے سیر ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ سیروں کے حساب سے بکتا ہے یا گزوں کے حساب سے۔''

زبیدہ : ''بھائی جان یہ تو آپ کی زبردستی ہے۔ وقت سے زیادہ قیمتی تو دنیا میں

شاید ہی کوئی ہو۔''

قاضی جی : ''ان صاحبزادی یعنی ہمشیرہ عزیزہ کا دماغ سب سے زیادہ گڑ بڑ نظر آتا ہے۔ کمال ہے صاحب کہ اس لڑکی نے خود اپنے خاندان کی ہر روایت کو ایسا صاف بھلایا ہے کہ بس میں کیا کہوں۔ حالانکہ ان کو خوش ہونا چاہیے تھا کہ آج بھائی ان روایات کو زندہ کرنے کا ارادہ کر رہا ہے، جو اس خاندان کا طرۂ امتیاز تھیں۔ ہائے ہائے کیسی چہل پہل رہتی تھی دادا جان جنت مکانی کے وقت میں۔ بیٹھک میں ایک طرف اگر شطرنج جمی ہوئی ہے تو دوسری طرف گنجفہ ہو رہا ہے۔ ادھر چوسر کا پو بارہ ہو رہا ہے تو ادھر تاش میں وارے نیارے ہو رہے ہیں۔ پیچوان لگے ہوئے ہیں، خمیرہ مہک رہا ہے۔ چائے کے دور چل رہے ہیں۔ پستئی پانوں سے خاصدان بھرے ہوئے ہیں۔''

بیوی : ''اسی کا نتیجہ تو ہے کہ نحوست جھاڑ و پھیر گئی ایک سرے سے۔''

قاضی جی : ''اللہ بخشے ابا جان کے وقت میں وہ بات تو خیر نہ تھی مگر ان کو بھی شطرنج کا تو ایسا شوق تھا کہ ایک ایک نقشہ پر آ کر جو بازی اڑی ہے تو صبح سے شام ہو گئی۔ اب کھانا وہیں ہوگا پینا وہیں ہوگا۔ حد یہ ہے کہ دادی جان کا جس وقت انتقال ہوا ہے ابا جان پر شہ پڑ رہی تھی۔ گھر میں ایک کہرام مچ گیا مگر وہ مات دیکر ہی اٹھے۔''

زبیدہ : ''بیان آپ کر رہے ہیں اور شرم مجھ کو آ رہی ہے۔''

قاضی جی : ''کیا مطلب؟ یعنی وہ مات لے لیتے۔ ارے بھئی تم کو کیا معلوم کہ اس وقت اگر وہ ماں سے دودھ بخشوانے کی فکر کرتے تو باپ کی روح کس قدر شرمندہ ہوتی۔ کہ انھوں نے جیتے جی کبھی کسی سے مات نہیں

کھائی اور ان کی اولاد مات کھا جاتی۔ یہ باتیں اب کہاں سے آئیں گی اس زمانہ میں۔ وہی مثل کہ ع گذر گیا ہے زمانہ گلے لگائے......

مطلب یہ کہ وہ زمانہ اب کہاں۔''

جمیلہ : ''اللہ نہ کرے اب یہ باتیں پھر واپس آئیں۔ بہت دنوں تک ان باتوں کا نتیجہ بھگت چکے۔''

بیوی : ''میرے تو جیسے آگ لگ جاتی ہے یہ باتیں سن سن کر۔''

قاضی جی : ''تم اپنی نہ کہو۔ میرے بزرگوں کے ذکر سے آگ نہ لگے گی تو کیا پھول برلیں گے تم پر۔ مگر اب تم جلو یا کڑھو۔ بہرحال وہ تو رئیس تھے ریاست کر گئے۔ زندگی کی دلچسپیاں ان کے لیے وقت کو تنگ بنائے ہوئے تھیں اور ایک ہم ہیں کہ ذرا سا وقت کاٹنے کے لیے اگر ذرا شطرنج بھی کھیلنا چاہیں تو گھوڑا غائب۔ اے بھائی یہ آخر ہوا کیا گھوڑا۔''

زبیدہ : ''بھائی جان یہ تو وقت وقت کی بات ہے۔ اس زمانہ میں اگر وقت کی قدر و قیمت محسوس نہیں کی گئی تو نہ سہی، مگر اس وقت ہم سب کے لیے وقت کا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہے۔''

قاضی جی : ''تو میں کب کہتا ہوں کہ قیمتی نہیں ہے اب آخر اس میں میرا کیا قصور کہ گھوڑا ہی نہیں مل رہا ہے ورنہ جب تک چھٹن خاں آتے میں بازی ہی لگاتا۔

بیوی : ''چولہے میں گئے چھٹن خان۔

قاضی جی : ''وہ کس تقریب میں۔ یعنی خواہ مخواہ بھی۔ ایک تو وہ بیچارہ اپنی بستر مرگ پر پڑی ہوئی بیوی کو چھوڑ کر آپ کے شوہر کا دل بہلانے کو آ رہا

ہے اور آپ ہیں کہ بجائے احسان مند ہونے کے اسی کو چولھے میں روانہ فرما رہی ہیں۔ وہ مثل کہ نیکی کر دریا میں ڈال۔ مگر وہ تو بات یہ ہے نا کہ خود شوہر ہی کی دلچسپی کب گوارا ہے بیگم صاحبہ کو۔ وہ تو چاہتی ہیں کہ شوہر بس یونہی بے درارشہ پڑا رہے۔’’

جمیلہ : ‘‘دولہا بھائی یہ عمر آئی آپ کی اور اب تک کھیل سے جی نہیں بھرا۔’’

قاضی جی : ‘‘جی نہیں اب مجھ کو چاہیے یہ کہ آپ کی آپا کے سامنے قاعدہ بغدادی لے کر الف دو زبر اَن دو زیر اِن دو پیش اُن پڑھنے بیٹھا جاؤں۔ سوال یہ ہے کہ میں کمبخت بھی اس زندگی کو کسی طرح کاٹوں یا نہیں۔ آخر مطلب کیا ہے آپ لوگوں کا۔’’

زبیدہ : ‘‘بھائی جان ہم لوگوں کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اب تک اپنا قیمتی وقت برباد کر کے اس کی جو سزا بھگتی وہ ہمارے لیے کافی ہونا چاہیے۔ بہت سو چکے گھوڑے بیچ کر۔’’

قاضی جی : ‘‘گھوڑے بیچ کر۔ خیر گھوڑے بیچ کر تو سو چکے مگر آخر یہ ہوا کیا۔ اس میں کا ایک گھوڑا۔ اگر اس گھر میں بچے بالے ہوتے تو ایک بات بھی تھی۔ مگر بچے کہاں۔ اکثر سوچا کرتا ہوں کہ گویا یہ خاندان بس مجھ ہی پر ختم۔ بعد میں کوئی نام لیوا بھی نہ ہوگا۔ دوستوں کو دیکھتا ہوں کہ زندگی بھر میں بس ایک ہی شادی کی مگر درجنوں بچوں کے باپ بنے بیٹھے ہیں۔ یہاں اتنی شادیاں کر چکے ہیں مگر وہی ڈھاک کے تین پات۔’’

جمیلہ : ‘‘یہ تو خدا کی دین ہے۔ کیا تعجب ہے کہ اب بھی خدا آپ کو اولاد کی دولت بخش دے۔’’

قاضی جی : ‘‘ہاں یہ تو ہے۔ اب مجھ ہی کو دیکھ لو کہ کون سی امید باقی رہ گئی تھی

ابا جان کے یہاں اولاد کی۔ گنڈے۔ تعویذ۔ دوا۔ دعا۔ سب ہی کچھ کر کے تھک چکے تھے کہ ایک دن جناب بس میں پیدا ہو گیا اور پھر پیدا بھی ایسا ہوا کہ سبحان اللہ! یعنی سوکھے دھانوں گویا پانی پڑ گیا۔ سنا ہے کہ ابا جان بیٹھک میں بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ لاحول ولا قوۃ۔ ارے صاحب مجھ کو باتوں میں لگا لیا۔ اور گھوڑا بدستور غائب ہے۔ وہ آتا ہوگا بیچارہ چھٹن خاں۔ خدا کے واسطے اٹھ کر ذرا دیکھ لو اِدھر اُدھر۔’’

بیوی ‘‘بھلا بتاؤ۔ خدا جانے کب نگوڑ مارا کھویا ہے اور اب چلے ہیں ڈھنڈوانے۔’’

قاضی جی : ‘‘سوال یہ ہے کہ یہ آخر آپ کون سا ضروری کام انجام دے رہی ہیں۔ پرانے چیتھڑوں کا ایک ڈھیر سامنے رکھ لیا ہے اور بغیر سوچے سمجھے سیتی چلی جا رہی ہیں۔ خدا جانے کیا۔ آخر یہ ہے کیا واہیات۔’’

زبیدہ : ‘‘پُرانے کپڑوں کو درست کر کے محتاج خانے بھیجنے کے لیے ٹھیک کر رہی ہیں۔’’

قاضی جی : ‘‘اب گویا یہ وقت کی بربادی نہیں ہے۔ اگر اٹھ کر ذرا سب ڈھونڈنے پر لگ جائیں تو گھوڑا کیا معنی ہاتھی تک مل سکتا ہے۔ مگر وہ تو بات یہ ہے کہ ان کو محتاج خانہ کہ محتاجوں پر ترس آ سکتا ہے۔ باہر سے آئے ہوئے مہاجرین کے لیے ایک سے ایک مہمل کام اپنے ذمے لے سکتی ہیں۔ مگر کیا مجال کہ شوہر نامراد کا کوئی کام ان سے نکل جائے۔ ان کے نزدیک دنیا کی سب سے زیادہ بیکار چیز خود ان کا شوہر ہے۔’’

بیوی : ”تم صرف اپنا ہی نہیں دوسروں کا وقت بھی برباد کرانا چاہتے ہو۔ جب میں جانتی ہوں کہ ڈھونڈنے کا کوئی نتیجہ نہیں تو کیا کروں میں وقت کھوکر۔“

قاضی جی : ”آج خدا جانے کہاں سے وقت کا وظیفہ سیکھ آئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر میری شطرنج سے بقول آپ کے وقت برباد ہوتا ہے تو ذرا میں بھی تو سنوں کہ وقت آخر کارآمد کیوں کر ہوسکتا ہے۔ کیا کیا کروں آخر میں۔ دماغ میں خشکی اتنی ہے کہ رات بھر تو خیر سولیتا ہوں۔ مگر دن کو کیا مجال کہ دوڈھائی گھنٹہ سے زیادہ نیند آئے۔ پھر سوال یہ ہے کہ آدمی آخر کیا کرے۔“

بیوی : ” آدمی کرنا چاہے تو بہت کچھ کرسکتا ہے۔ اس وقت ہمارے پاکستان کو ہر قسم کے کام کرنے والوں کے ایک ایک لمحہ کی ضرورت ہے۔“

قاضی جی : ”شاباش! میں تو حیران تھا کہ آج اب تک پاکستان جناب کو کیوں یاد نہیں آیا۔ مگر بھلا یہ ممکن تھا؟ آخر کسی نہ کسی طرح سمیٹ سماٹ کر لے آئیں پاکستان کا ذکر۔ اب بھلا بتایئے کہ کہاں پاکستان کہاں شطرنج کا گھوڑا۔“

چھٹن خاں : ”(دروازے پر دستک دیتے ہوئے) جناب قاضی صاحب۔ قاضی جی تشریف رکھتے ہیں؟“

قاضی جی : ”آرہا ہوں بھئی گھوڑے صاحب۔ وہ یعنی میرا مطلب ہے حاضر ہوا چھٹن صاحب......توبہ ہے اب بتایئے میں اس غریب کو کیا منہ دکھاؤں گا جو اپنی بیمار بیوی کو چھوڑ کر مجھ نامراد سے شطرنج کھیلنے آیا ہے اور میں تندرست بیوی کے ہوتے ہوئے ایک گھوڑا ہی کھوئے بیٹھا ہوں۔ زبیدہ تم میری کھڑاؤں کی کھونٹی نکال دو۔ وقت تو کسی طرح برباد نہ ہو۔ جمیلہ ذرا پاندان سنبھالو۔ اور۔ اور۔ کچھ چائے وائے۔ مگر پہلے کھڑاؤں کی کھونٹی بھیجو باہر۔“

(۱۴)

(قاضی جی دروازے پر آواز دیتے ہیں)

قاضی جی : ''ارے صاحب میں آسکتا ہوں؟ ذرا میں اپنے کمرے میں نکل جاؤں۔''

بیوی : ''(دور سے آواز دیتے ہوئے) ہاں ہاں تو آجاؤ نا! تم سے کوئی چھپنے والا تھوڑی ہے۔ کنیز بہن ہیں۔''

قاضی جی : ''(آتے ہوئے) کون بہن؟ یعنی یہ بہن کی کون سی قسم بیٹھے بیٹھے ایجاد کرلی۔''

کنیز : 'تسلیم بھائی جان۔ میں ہوں کنیز۔''

قاضی جی : ''اخاہ یعنی تم ہو۔ پھر یہ پردے کی کیا لغویت تھی کہ صاحب چادریں تانی گئیں۔ برقعہ اچھالا گیا۔ میں تو سمجھا کہ کوئی نہایت ہی پردہ نشین بیوی آگئی ہیں۔ اور اب میں نکلا گھر سے۔ مگر یہ تم آ کیسے گئیں۔ نہ کوئی اطلاع نہ کوئی خبر۔''

بیوی : ''ارے بیچاری جس مصیبت میں آئی ہیں کچھ نہ پوچھو۔ بھرا گھر بس اسی طرح چھوڑ کر جسم کے ان ہی کپڑوں کے ساتھ آئی ہیں۔ سب ہی کچھ بیچاری کا چھوٹ گیا۔''

قاضی جی : ''ہاں صاحب بالکل وہی کیفیت ہوئی گویا ان کے ساتھ بھی، جو ہم لوگوں پر گذری ہے۔''

بیوی : ''لو اور سنو، تم پر اللہ نہ کرے کیا کیفیت گذری ہے۔''

قاضی جی : ''جان بوجھ کر جب تم اس قسم کی باتیں کرتی ہو تو اور بھی آگ لگ جاتی ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ مجھ پر کیا گذرتی ہے۔ خدا جانتا ہے تم سے چھپ چھپ کر رویا کرتا ہوں۔ بھوک پیاس سب تشریف لے گئی ہے۔ اتنے ہی دنوں میں آدھا بھی نہیں رہا ہوں اور دیکھ لینا کہ یہی ہر وقت کا غم اسی طرح گھلا گھلا کر ختم کردے گا مجھ کو۔''

کنیز : ''آپ مرد ہو کر ایسی باتیں کرتے ہیں بھائی جان۔ اور مجھ کو دیکھئے کہ اللہ جانتا ہے جو رتی بھر بھی مجھ کو کسی چیز کے چھوٹنے کا کوئی غم ہو۔ میں تو خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ عزت آبرو کے ساتھ کسی نہ کسی طرح پاکستان پہونچ گئی۔''

بیوی : ''واقعی خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اُن لوگوں کو دیکھ کر صبر کرنا چاہیے جو ان سے بھی گئی گذری حالت میں یہاں تک پہونچے ہیں۔ اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ سب کچھ کھویا۔ مگر پاکستان پالیا تو سب کچھ پالیا۔''

قاضی جی : ''کمال ہے صاحب، واقعی کمال ہے۔ معلوم نہیں وہ لوگ کس چیز کے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ ایک ایک چیز جب یاد آتی ہے تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں رات کٹ جاتی ہے۔ کل ہی تمام رات جاگتا رہا۔''

بیوی : ''اللہ اللہ کرو۔ رات بھر تو خراٹے لیتے رہے ہو۔ جب رات کو میں نے اُٹھ کر ناک بند کی ہے تو خراٹے کم ہوئے۔''

قاضی جی : ’’خیر تم تو یونہی ناک میں دم کیا کرتی ہو۔ اب یہ بھی میری قسمت کہ میں بھرتا ہوں ٹھنڈی آہیں اور بیوی صاحبہ سمجھتی ہیں کہ گویا خراٹے لے رہا ہوں۔ ہائے ہائے رات کو دیکھتا کیا ہوں کہ گویا وہی اپنا گھر ہے۔ اور میں اپنے اسی کمرے میں جہاں طالب علمی کے زمانہ میں رہا کرتا تھا والد صاحب کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا ہوں، اور والد صاحب اسی طرح فرما رہے ہیں کہ میاں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ نوالہ چبا کر کھاؤ کھانا بھاگا نہیں جاتا ہے۔ پھر خدا جانے اور کیا کیا دیکھتا رہا کچھ والدہ کو دیکھا تھا کہ چھالیا کتر رہی ہیں۔‘‘

بیوی : ’’اور تم تو کہہ رہے تھے کہ میں سویا نہیں رات بھر۔ خواب کیا جاگتے میں دیکھا تھا۔‘‘

قاضی جی : ’’لیجیے وہاں شروع ہو گیا ڈھل پن۔ جو شخص اپنی زندگی سے عاجز ہو، جس کے دل پر چوبیس گھنٹے ایک قیامت گذر رہی ہو۔ اس کے ساتھ اس کی رفیقۂ حیات کا یہ سلوک ہے کہ جیسے کوئی کسی کی سوتیلی بیوی ہو اور وہ جان جان کر چڑ کے لگائے۔ ایک ایک بات پکڑی جاتی ہے یہاں۔ کلیجہ پر ہر وقت ایک سانپ لوٹ رہا ہے اور ان کو اٹکھیلیاں سوجھی ہیں۔ وہی مثل کہ ۔ تجھے بیزاریاں سوجھی۔ یعنی۔ وہ۔ تجھے سوجھی ہیں۔ خیر ہو گی کوئی مثل مطلب یہ کہ عجیب رنگ ہے۔‘‘

کنیز : ’’مگر بھائی جان اللہ نہ کرے ایسی کون سی بات ہے جس نے آپ کا یہ حال بنا رکھا ہے۔ اللہ نہ کرے آپ پر وہ مصیبتیں بھی نہیں گذریں جو دوسرے مہاجروں پر گذر چکی ہیں۔‘‘

قاضی جی : ’’اب میں کیسے اپنا دل چیر کر آپ لوگوں کو دکھا دوں کہ دیکھو اس کمبخت

پر کوئی مصیبت گذری ہے یا نہیں۔ ایک دو مصیبتیں ہوں تو کوئی بیان بھی کرے۔ دوسرے، میں تو اپنا دکھ کسی سے کہتا بھی نہیں۔ خدا گواہ ہے کہ اب تک تو اس پردیس میں دل کو اطمینان یہ تھا کہ بھائی ہم بھی کوئی گویا بے در بے گھر نہیں ہیں۔ جب جی چاہے گا اپنے گھر چلے جائیں گے۔ مگر اب گویا چھوٹا گھر بار سب کچھ۔‘‘

بیوی : ’’اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے خدا جانے بیچارے کا کیا کچھ چھوٹ گیا ہے۔ ایک ٹوٹا پھوٹا ویران سا گھر تھا، صدقے کیا اس کو پاکستان پر سے۔‘‘

کنیز : ’’بھائی صاحب یہ تو دیکھئے کہ کس کام کا وہ اپنا گھر جو اپنے وطن میں نہ ہو۔ اپنوں میں نہ ہو پرائی دنیا میں ہو۔ اس ایک چھوٹے سے گھر کی جگہ خدا نے آپ کو اتنا بڑا گھر دے دیا۔‘‘

قاضی جی : ’’کون یہ گھر؟ سبحان اللہ۔ ارے صاحب ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو پورے چالیس روپے دینا پڑتے ہیں۔ بجلی اور پانی کا حساب الگ ہے۔ اس سے کوئی مطلب نہیں۔‘‘

بیوی : ’’اس گھر کو نہیں کہہ رہی ہیں۔ ان کا مطلب ہے پاکستان سے۔‘‘

قاضی جی : ’’بجا ارشاد، تو گویا پاکستان مجھ ہی کو تو ملا ہے، یہ اپنا گھر ہے۔ اسی لیے تو ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو چالیس روپیہ کی سولی میری جان پر لگائی جاتی ہے کرایہ کے نام۔‘‘

کنیز : ’’مگر وہ کرایہ جاتا کہاں ہے؟ آپ کی ایک جیب سے نکل کر آپ کی دوسری جیب میں پہونچ جاتا ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’لیجیے یک نہ شد دو شد۔ بہن صاحبہ تشریف لائی ہیں۔ وہ بیگم صاحبہ

سے بھی زیادہ قابل ہیں۔ اب تو میرا خدا ہی حافظ ہے ؎

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پیچ آفت نہ رسد...... یعنی......

یعنی۔ میرا مطلب ہے ع

دوسری پڑگئی کیسی مرے اللہ نئی

تو وہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ۔ دولہا تو تمہارے پہلے ہی کراچی جا چکے تھے۔"

کنیز : 'جی ہاں وہ تو پچھلے مہینے چلے گئے تھے۔ اب میں نے یہ سوچا کہ گرہستی کا خیال تو اس وقت چھوڑ ہی دینا چاہیے۔ جان ہے تو جہاں ہے۔ بس میں بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ چلتی بنی۔"

قاضی جی : "خوب سوچا جناب نے۔ کم سے کم میں ایسی حماقت کی بات کبھی نہیں سوچ سکتا۔ میری تو آنکھوں کے سامنے اپنی ایک ایک چیز کا نقشہ ہر وقت پھرا کرتا ہے اور وہ چیزیں اب گویا کبھی نہیں مل سکتیں۔"

بیوی : "آخر کچھ معلوم تو ہوں وہ چیزیں۔ ایک ایک چیز تو بٹور کر پہلے ہی لا چکے ہیں۔ اب تو کاٹ کباڑ کے سوا وہاں میرے خیال میں کوئی ایسی چیز نہ بھی جس کا اتنا غم ہو رہا ہو۔"

قاضی جی : "خیر آپ تو اپنے خیال کو رہنے ہی دیجیے۔ آپ کے خیال میں تو اگر میں بھی وہاں اتفاق سے پڑا رہ جاتا تو آپ مجھ کو بھی کاٹ کباڑ ہی سمجھ کر صبر کر لیتیں۔ ارے صاحب اسی کاٹ کباڑ میں خدا جانے کیا کیا ہے۔ مثال کے طور پر کہتا ہوں کہ کمرے کے اندر جو الماری ہے اس میں علاوہ دوسری کتابوں کے ایک بیاض بھی ہے۔ نہایت قیمتی نسخے

اس میں درج ہیں۔ مثلاً ایک خضاب کا نسخہ ایسا ہے کہ اگر آج وہ بیاض میرے پاس ہوتی تو خضاب بناتا اور پاکستان خضاب کے نام سے پورا کارخانہ کھول کر ہزاروں کما لیتا۔ یا باہر کی صحنچی میں ایک بورا پڑا ہوا ہے کوئلے کا بھرا ہوا۔"

کنیز : '(ہنس کر) کیا باتیں ہیں بھائی جان آپ کی بھی۔ وہی مثل کہ لکھ لٹیں اور کوئلوں پر مہر۔ یہاں لاکھوں کی تباہی کی پروا نہیں اور آپ کر رہے ہیں کوئلوں کا ذکر۔"

قاضی جی : "لاحول ولا قوۃ۔ جب آپ کو کوئی بات معلوم ہی نہیں ہے تو قابلیت جتانے سے کیا فائدہ۔ آپ کو کیا معلوم کہ یہاں کوئلہ کی کتنی کمی ہے۔ اور ایک کوئلہ پر کیا ہے میری جوانی کی جتنی تصویریں ہیں سب وہیں رہ گئیں۔ اب گویا ہم یہ دیکھنے کو بھی ترس جائیں گے کہ ہم جوانی میں کیسے تھے۔ خاندان کا شجرہ تک تو وہاں رہ گیا ہے۔ اپنی شرافت کو گویا ہمیشہ کے لیے مشکوک کر بیٹھ رہے۔"

بیوی : "میں تو یہ کہتی ہوں کہ باہر بھی جب تم اسی قسم کی باتیں کرتے ہو گے تو سب کیا کہتے ہوں گے۔"

قاضی جی : "کہیں گے کیا منہ دیکھ کر رہ جاتے ہیں۔ ذرا اس دل گردے کا کوئی ہو کر تو دیکھ لے کہ اتنے نقصانوں پر بھی نہ میں اپنا رونا کسی کے سامنے روتا ہوں اور نہ دراصل اس سے کوئی فائدہ ہے۔ البتہ اگر یہ کہا جائے کہ میں خود بھی اثر نہ لوں تو غلط ہے۔ اندر ہی اس غم میں گھل رہا ہوں جیسے لکڑی میں گھن لگ جائے۔ بھئی کنیز تمہیں میری قسم، تم نے کبھی ایسی خراب میری صحت کبھی اور بھی دیکھی تھی۔"

کنیز : 'مگر بھائی جان یہ وقت تو کھوئی چیزوں کے غم کرنے کا نہیں بلکہ پائی ہوئی چیزوں پر خوش ہونے کا ہے۔ اس وقت تو نئی امنگوں اور نئے حوصلوں کے ساتھ پاکستان کو اپنانے کی ضرورت ہے۔"

قاضی جی : "چلئے چھٹی ہوئی۔ جناب تشریف لائی ہیں تو آپ کو بھی پاکستان ہی کی دھن لگی ہوئی ہے۔ اب یہ پاکستان مجھ سے گھر بھی چھوڑائے گا۔ مہربانی فرما کر میری چارپائی تو آپ دونوں نند بھاوج باہر ڈلوا دیجئے ورنہ میرا دماغ ہو جائے گا خراب۔ اس گھر میں ایک یہی کیا کم تھیں مجھ کو ہر وقت چڑھانے کے لیے کہ اب آپ بھی میرا ناطقہ بند کریں گی۔ میں تو دیکھ کر خوش ہوا تھا کہ چلو بہن آ گئی اس غربت میں یہی میری طرفداری تو کریگی۔ مگر اب تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مل کر مجھ کو زندہ بھی نہ رہنے دیں گی۔"

بیوی : "خدا کے لیے کنیز بہن ان کے سامنے پاکستان کی طرفداری نہ کیا کرو۔ ان کی سمجھ میں کسی طرح پاکستان نہیں آ سکتا۔"

کنیز : 'بات یہ ہے کہ بھائی جان ذرا ذرا سی بات سے گھبرا جانے کے ہمیشہ عادی ہیں۔"

قاضی جی : "پھر وہی ذرا سی بات؟ ارے صاحب یہ ذرا سی بات ہے کہ گھر بار چھوٹا۔ عزیز و اقارب چھوٹے۔ دوست احباب چھوٹے۔ ایک ایک چیز چھوٹ گئی آخر کس کس طرف سے انسان اپنے دل کو سمجھائے۔ ایک آنکھ خشک کرتا ہوں۔ دوسری گنگا جمنا بہانے لگتی ہے۔ تم کو یاد ہوگا کنیز وہ میرا امراد آبادی حقہ۔ اب اگر میں سو روپیہ بھی خرچ کروں تو ویسا حقہ مجھ کو نہیں مل سکتا۔ خدا جانے کن صاحب کے ہاتھ لگے گا اور

اگر اس پر ان حضرت نے سلفہ پی لیا تو سمجھئے کہ غارت ہو کر رہ جائے گا۔"

بیوی : "(ہنس کر) توبہ ہے اللہ۔ بس یہ حال ہو کر رہ گیا ہے اب ان کے دماغ کا۔ دن رات اسی قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں کوئی ان سے لے لے۔ اب کوئی پوچھے، تمہاری بلا سے اس پر سلفہ پیا جائے یا کچھ ہو۔ چھوٹے گاؤں سے ناطہ ہی کیا۔"

کنیز : 'سچ مچ بھائی جان آپ تو ایسی ایسی چیزوں کا غم لے کر سوگ منا رہے ہیں جن کا کسی کو خیال بھی نہ آتا ہوگا۔ ذرا ان لوگوں کو دیکھئے جو واقعی لٹ گئے ہیں۔ ان ماؤں سے پوچھئے جن کی گودیاں ویران ہو گئی ہیں۔ ان بدنصیبوں سے پوچھئے جو بیوی بچوں سب کو صبر کر کے بیٹھ رہے ہیں اور پھر پاکستان میں اپنی نئی زندگی ایک نئے حوصلہ کے ساتھ شروع کر رہے ہیں۔"

قاضی جی : "اللہ اکبر۔ کیا تقریر فرمائی ہے جناب نے۔ بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ یہ گھر کی بیٹھنے والی وہ عورتیں ہیں جن کو بولنا بھی نہ آتا تھا۔ اب کوئی دیکھے ان کی چٹاخ پٹاخ قینچی کی طرح زبان چلتی ہے۔ سیاسیات میں دخل دیتی ہیں۔ ملکی اور قومی معاملات میں ٹانگ اڑاتی ہیں۔ اور گفتگو میں بالکل وہی روانی موجود ہے جو تقریر کرنے والے لیڈروں کی تقریروں میں ہوا کرتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا زمانہ آ لگا ہے۔ نہ ہوئے اس وقت والد صاحب زندہ، اختلاج ہونے لگتا۔ بھتیجی صاحبہ کی یہ اسپیچ سن کر ہوش اڑ جاتے۔ بھاگتے سر پر پیر رکھ کر۔"

کنیز : 'یوں آپ کا جو جی چاہے کہہ لیجیے بھائی جان مگر سچ پوچھئے تو یہ امتحان کا

وقت ہے۔ اس وقت ہم کو ہر حیثیت سے ثابت قدم۔ مستقل مزاج۔ صابر اور شاکر۔ بلند حوصلہ۔"

قاضی جی : "مرنجان مرنج۔ بنات النعش۔ قوس وقزح۔ گلوئے نیب۔ پوست بنج کاسنی۔ الامان والحفیظ۔ بھلا غضب خدا کا یہ بیگماتی زبان ہے؟ یہ عورتوں کی بول چال ہے؟ یہ گھر میں بیٹھنے والیوں کی بولی ٹھولی ہے؟ ایک سے ایک مردانہ لفظ۔ معلوم ہوتا ہے کہ عورت نہیں کوئی پروفیسر لیکچر دے رہا ہے۔ صاحب عجیب انقلاب آیا ہے اور کسی چیز کا غم تو درکنار یہاں تو گھر بیٹھنے والی عورتیں تک کیا سے کیا ہوئی جاتی ہیں۔"

بیوی : "جب مردوں کا وہ حال ہو جو تمہارا ہے تو عورتوں ہی کو تمہارے حصہ کا کام سنبھالنا پڑیگا۔ اس وقت پاکستان کو سب کی مدد کی ضرورت ہے۔ یہ وقت کھوئی ہوئی چیزوں کو بیٹھ کر رونے کا نہیں بلکہ پائی ہوئی چیزوں کو ہوش سے سنبھالنے کا ہے۔"

قاضی جی : "تو ایک کام کرو نا۔ بندوق میں بھرو ایک گولی اور مجھ مردود کو مار دو۔ گلا گھونٹ دو میرا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرف نکل جاؤں اور کس طرح ان سب کو مجھ سے نجات حاصل ہو۔ موت بھی تو مجھ کو بھول گئی ہے۔ اور زندگی یہ ہے لعنت ہے۔ اس زندگی پر۔"

(۱۵)

(دروازہ کھلتا ہے اور بیوی آتی ہے)

قاضی جی : "کون صاحب ہیں؟"

بیوی : "(آتے ہوئے) اوئی؟ نہ کوئی صاحب ہیں نہ کچھ۔ میں ہی تھی۔"

قاضی جی : "صاحب آپ سے آج مجھ کو طے کرنا ہے کہ آخر آپ کا ارادہ کیا ہے؟ گھر میں جو آ کر دیکھا تو جناب غائب۔ ادھر دیکھ اُدھر دیکھ آخر تھک کر بیٹھا رہا۔ پھر طرح طرح کے وہم شروع ہو گئے کہ خدا جانے آپ پر کیا افتاد گذری ہے۔ کسی سے یہ کہہ بھی نہیں سکتا کہ بیوی غائب ہو گئی۔ آخر مجبور ہو کر پولیس میں اطلاع دینے جا رہا تھا اور بیٹھا ہوا تمہارا حلیہ لکھ رہا تھا۔ کہاں گیا وہ کاغذ۔ ہاں یہ رہا بس اتنا ہی لکھا تھا کہ زوجۂ فدوی عمر تقریباً تیس سال جسم چھریرا۔ سرو قد۔ گیسو دراز۔ کتابی چہرہ۔ بائیں رخسار تاباں پر وہ تل جس کی شعراء تعریف کرتے ہیں۔ آنکھوں میں وہ کیفیت جو بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ باقی حلیہ کچھ ذہن سے اتر سا گیا تھا لہٰذا میں نے یہ مصرعہ لکھ دیا ؏

کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا ست"

بیوی : "توبہ ہے تم سے بھی۔ یہ حلیہ لکھ کر پولیس کو دیا جا رہا تھا۔ وہ لوگ بھی

کیا کہتے۔‘‘

قاضی جی : ’’خیر وہ تو جو کچھ بھی کہتے مگر یہ آخر آپ غائب کہاں تھیں۔‘‘

بیوی : ’’میں ذرا قصرِ استقلال تک گئی تھی۔‘‘

قاضی جی : ’’یہ کون صاحب ہیں۔ ارے بھئی میں نے تو کبھی ان کا نام بھی نہیں سنا۔ آخر یہ ہیں کون بزرگ؟‘‘

بیوی : ’’نہ کوئی صاحب ہے نہ کوئی بزرگ۔ یہ تو مہاجر خواتین کا صنعتی گھر ہے جہاں عورتوں اور لڑکیوں کو طرح طرح کی دستکاری سکھائی جاتی ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’سکھائی جاتی ہوگی۔ دنیا میں بہت کچھ سکھایا پڑھایا جاتا ہے مگر آپ سے کیا مطلب تھا۔ یعنی آپ کو بیٹھے بٹھائے یہ کیا سوجھی کہ برقعہ سنبھالا اور جا پہونچیں قصر۔ قصر۔ کیا نام لیا تھا ابھی کچھ کتابوں کا ایسا۔‘‘

بیوی : ’’قصرِ استقلال۔‘‘

قاضی جی : ’’جی ہاں وہی قصرِ استقلال۔ دوسرے آدمی کہیں جاتا ہے تو کم سے کم اطلاع تو کر دیتا ہے تاکہ پسماندگان ٹاپتے نہ پھریں۔ مگر نہیں پسماندگان تو تمہاری جان سے دور مرنے والے کے رشتہ داروں کو کہتے ہیں۔ میرا مطلب یہ کہ کمبخت شوہر ٹاپا نہ پھرے۔ خدا جانتا ہے پہلے تو سخت غصہ آیا پھر وہم جو آنے لگے تو کلیجہ جیسے مسلنے لگا۔ تمہاری ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ پھر خیال آیا کہ اگر دشمنوں نے تم کو ختم کر دیا تو خود میری زندگی بھی اب بیکار ہے۔ مختصر یہ کہ صاحب ایک قیامت گذر گئی اتنی ہی دیر میں اور آپ ہیں کہ ہنس رہی ہیں گویا۔‘‘

بیوی : ’’نہیں وہ بات یہ ہوئی کہ زبیدہ بہن نے قصرِ استقلال کے متعلق بات تو کی تھی مگر مجھ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ آج ہی آجائیں گی موٹر لے کر۔ اب وہ آگئی تھیں تو میں نے کہا کہ لاؤ ہو ہی آؤں۔‘‘

قاضی جی : ’’ہاں ہاں تو اچھا کیا کہ ہو آئیں مگر ٹھہرو تو اچھا کیسے کیا۔ میں تو سخت پریشان ہو گیا تھا۔ ارے صاحب جا رہی تھیں تو کسی سے کہہ ہی گئی ہوتیں ایک پرچہ ہی لکھ کر رکھ دیا ہوتا۔ مگر مطلب تو تمہارا ہوتا ہے کہ کسی طرح شوہر نامراد کی دل آزادی ہو۔ کسی طرح وہ کمبخت پریشان ہو۔ تم تو بہانے ڈھونڈھتی ہو ستانے کے۔ خدا جانے کہ کب تک میری وفاؤں کو آزمانے کا سلسلہ جاری رہے گا۔ کبھی تو خوش ہو کر یہ بھی کہہ دو: ع

جا تجھے کشمکش دہر سے آزاد کیا

بیوی : ’’توبہ ہے بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہو تم تو۔ تم کو کیا معلوم کہ وہاں جانا کس قدر ضروری تھا۔

قاضی جی : ’’بیشک۔ بیشک۔ آپ ہی کے سپرد تو پاکستان کا تمام انتظام ہے اور آپ ہی کے بھروسے پر پاکستان حاصل کیا گیا ہے۔ آپ کے لیے وہاں جانا ضروری نہ ہوتا تو کس کے لیے ہوتا، اور آپ نے وہاں جا کر وہ تیر مارا ہوگا کہ سب دنگ رہ گئے ہوں گے۔‘‘

بیوی : ’’لو زبیدہ بہن بھی آگئیں۔ اب ان ہی سے کہو یہی مجھ کو وہاں لے گئی تھیں۔‘‘

قاضی جی : ’’اوں؟ تو خیر۔ آؤ بھئی زبیدہ۔ یہ کون سا قصر تعمیر کر لیا تم نے اپنی بھاوج کو گھر سے اڑن چھو کرنے کے لیے۔‘‘

زبیدہ : ’’وہ ہے نا بھائی جان، راج گڑھ روڈ پر قصرِ استقلال جو کنیا مہاودیالہ کی عمارت میں ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’اچھا اچھا سمجھ گیا۔ مگر یہ راج گڑھ روڈ کون سی ہے۔ بہرحال ہوگی کوئی۔ سوال تو یہ ہے کہ وہاں ان کا کیا کام تھا۔ ان سے آخر کیا مطلب؟ ارے بھئی وہ عمارت میں قصر ہو یا قصر میں عمارت مگر ان سے کیا ہم لوگ جھونپڑوں میں رہ کر محل کے خواب دیکھیں ہی کیوں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز۔ مگر خیر اس کا فی الحال کوئی موقع نہ تھا۔ بہرحال تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ جو آپ کی بھاوج صاحبہ ہیں ان کی آخر کیا ضرورت پیش آگئی تھی وہاں۔‘‘

زبیدہ : ’’ان کی تو وہاں بے حد ضرورت تھی۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ وہاں ہوتا کیا ہے۔ آپ نے کچھ بتایا نہیں بھابی جان؟‘‘

بیوی : ’’بتاتی تو میں جب کہ یہ چپ بھی ہوئے ہوتے۔‘‘

زبیدہ : ’’بھائی جان وہاں اصل میں مہاجر خواتین اور لڑکیوں کو مختلف کام سکھانے کا انتظام کیا گیا ہے مثلاً ہر قسم کی دستکاری، سینا پرونا، صابن بنانا، کریم اور اسنو وغیرہ بنانا فنائل بنانا۔‘‘

قاضی جی : ’’اے صاحب تو میں سمجھ گیا یہ انتظام کیا گیا ہے تو بہت اچھا ہے۔ خدا مبارک کرے۔ صابن نہیں وہاں حلوہ سوہن بنایا جائے۔ میرا تو سوال صرف یہ ہے کہ یہ جو آپ کی بھاوج صاحبہ ہیں یہ آخر کس مد میں گئی تھیں وہاں۔‘‘

بیوی : ’’ہم لوگوں نے یہ طے کیا ہے کہ اس کام میں، ہم بھی حصہ لیں۔‘‘

قاضی جی : ’’جی؟ کیا فرمایا؟ حصہ لیں یعنی صابن بنایا کریں۔ فنائل بنایا کریں۔ آخر مطلب کیا ہے آپ کا؟ بس اب میرے لیے آپ کے طفیل میں یعنی آپ کے دم قدم کے تصدق میں یہی ایک کسر رہ گئی تھی کہ مجھ پر راستہ چلتے اس قسم کی انگلیاں اٹھنے لگیں کہ یہی ہے صابن والی کا میاں، یہی ہے اس فنائل والی کا شوہر جس کے یہاں سے ہمارے یہاں فنائل آتی ہے۔‘‘

زبیدہ : ’’بھائی جان یہ تو کوئی بری بات نہیں۔ ہنر سیکھنا کوئی عیب کی بات تو نہیں ہے۔ ہم نے تو یہی طے کیا تھا کہ ہم کو جو کچھ آتا ہے وہ تو ہم وہاں کی عورتوں اور لڑکیوں کو سکھا دیں اور جو نہیں آتا ہے وہ سیکھ لیں۔ یہ دونوں باتیں مفید ہیں۔‘‘

قاضی جی : ’’سنئے صاحب جہاں تک آپ کا تعلق ہے میں آپ کے متعلق تو کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔ آپ ماشاء اللہ شادی شدہ ہیں اپنے گھر کی ہیں۔ خیر شادی شدہ تو یہ بھی ہیں۔ ارے بھئی میری بیوی ہیں ہی آخر۔ مگر ان کے متعلق میں یہ بات کچھ اپنے لیے ڈوب مرنے کی سمجھتا ہوں کہ میری زندگی میں میری بیوی گویا یتیم خانہ میں داخل ہو جائے۔‘‘

بیوی : ’’ارے۔ ارے۔ ارے۔ جو منہ میں آتا ہے کہتے چلے جاتے ہو۔ میری یتیمی کا تمہاری زندگی سے کیا تعلق۔ دوسرے وہ کوئی صرف یتیم لڑکیوں کے لیے تو نہیں ہے وہاں تو ماں باپ والیاں بھی ہیں۔ سہاگنیں بھی ہیں اور یتیم اور بیوہ بھی۔‘‘

قاضی جی : ’’صاحب میرا مطلب یہ ہے کہ دنیا تو یہ نہیں دیکھتی کہ میں زندہ ہوں یا

مر گیا۔ اور نہ کسی کو یہ خبر ہوگی کی بیگم صاحبہ محض اپنے شوق کے لیے وہاں جاتی ہیں۔ کہنے والے تو یہی کہیں گے کہ لیجیے صاحب قاضی جی نے خدا جانے بیوی کو فاقوں مارا ہے یا کیا گت بنائی ہے کہ وہ بیچاری اب صابن بنانا سیکھ رہی ہیں اور دستکاری کی تعلیم دیتی پھرتی ہیں لڑکیوں کو۔ اگر اس طرح آپ کو میرے خاندان کی لٹیا ڈبونے کا شوق ہوا ہے تو دوسری بات ورنہ قضیانہ میں آج تک کسی خاتون نے اس قسم کے ارادے نہیں کیے تھے۔"

زبیدہ : "بھائی جان آپ اس کو اس رنگ میں سمجھیے کہ ہم لوگ جو کچھ سیکھیں گے وہ اپنے سے زیادہ دوسروں کے فائدے کے لیے ہوگا۔ اگر ہم نے کچھ اس قسم کی چیزیں بنانا سیکھ کر نادار اور مفلس بلکہ بے سہارا عورتوں اور لڑکیوں کو، جو اس وقت دوسروں کی محتاج ہیں، کچھ ہنر سکھا دیے تو وہ ملک اور قوم یا حکومت پر بار ہونے کے بجائے اپنے پیروں پر خود کھڑی ہو سکیں گی۔"

قاضی جی : "ارے صاحب ناک میں دم ہے میرا۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ آپ لوگوں نے ملک اور قوم تک کہنا شروع کر دیا ہے۔ بھلا غضب خدا کا! یہ ان بے زبان اللہ والیوں کی بہو بیٹیاں ہیں جن کی آواز تک سات پردوں میں رہا کرتی تھی۔ مجھ کو یاد آ رہی ہیں اس وقت شمسن نانی۔ تم نے تو دیکھا بھی نہ ہوگا ان کو زبیدہ۔"

زبیدہ : "کچھ یونہی سی یاد ہیں۔"

قاضی جی : "ہائے ہائے اس عمر میں ایسی بھولی بھالی باتیں کرتی تھیں کہ بس یہ سمجھ لو کہ۔ مطلب یہ کہ بس کچھ سمجھ لو۔ ہوا یہ کہ ٹونڈلہ کے اسٹیشن پر تمام سامان تو گاڑی میں رکھ دیا گیا اور یہ بیچاری برقعہ میں لپٹی ہوئی ایک طرف بیٹھی رہ گئیں۔ اب جو جناب گاڑی چلی ہے تو نانا صاحب مرحوم و مغفور کو یاد آیا کہ کچھ چھوٹ گیا ہے۔"

بیوی : "کیوں نہیں آخر تمہارے نانا جو ٹھہرے۔"

قاضی جی : "ٹھہرتے کیسے بیچارے آگرے سے جا کر تار دیا کہ میری بیوی رہ گئی ہیں۔ مگر اب ان سے جو پوچھا جاتا ہے تو غیر مرد کو جواب کیسے دیں، دوسرے شوہر کا نام کیسے لیں۔ مطلب یہ کہ پھر خدا جانے کیا ہوا زندگی بھر ہم لوگ چھیڑا کرتے تھے کہ شمسن نانی آپ نے چپ کیوں سادھ لی تھی۔ تو وہ یہی کہا کرتی تھیں کہ بھلا میں غیر مرد سے بات کیسے کرتی۔ اور صاحب یہ ان کی نواسی اور یہ نواس بہو ہیں کہ ایک درجن یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ بارہ بارہ ہاتھ کی زبانیں اللہ کے فضل سے موجود ہیں۔"

زبیدہ : "تو بھائی معاف کیجیے گا اب وہ وقت نہیں ہے۔ اب دنیا بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ عورتوں کو اپنے حدود میں رہ کر مردوں کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض بھی محسوس کرنا ہیں۔"

قاضی جی : "اے صاحب خدا کے واسطے میرے حال پر رحم فرمائیے۔ میرا تو کلیجہ ہل جاتا ہے جب میں عورت ذات کی زبان سے فرائض اور محسوس قسم کے بڑے بڑے لفظ سنتا ہوں۔ یہ داڑھی مونچھوں والے لفظ اور ادا ہوں عورت کی زبان سے خدا جانے کیا زمانہ آ گیا ہے۔ تو گویا آپ کا مطلب یہ ہے کہ اب تک جو دنیا کا کارخانہ چل رہا تھا اور بغیر عورتوں کے چل رہا تھا یہ سب گویا مہمل تھا اب چلی ہیں آپ

دنیا کو چلانے۔‘‘

بیوی : ’’اچھا یہ بتاؤ کہ اگر میں وہاں جا کر کچھ چیزیں بنانا سیکھ لوں گی یا جو کچھ مجھ کو آتا ہے وہ جا کر وہاں سکھا دوں گی تو اس میں تمہارا کیا نقصان ہے؟ اور اتنی سی بات کا آخر یہ بتنگڑ تم کیوں بنا رہے ہو۔‘‘

قاضی جی : ’’لیجیے گویا اس میں میرا کوئی نقصان ہی نہیں ہے۔ ایک تو نے دے کے صاحب ہماری بیوی وہ بھی قسمت سے لیڈری کرنا شروع کر دے۔ تو ہم تو گویا مرے بے موت۔ اب روٹیاں بیٹھ کر تھوپیں۔ چولہا پھونکیں، سل بٹے سے دل بہلائیں اس لیے کہ بیوی صاحبہ صابون بنانا سیکھنے گئی ہوئی ہیں، ملک وقوم کا منہ دھلانے کے لیے۔‘‘

زبیدہ : ’’سچ مچ بھائی جان آپ تو عجیب باتیں کرتے ہیں۔ اگر آپ ہی کی طرح اس وقت سب اسی قسم کی باتیں کرنے لگیں تو وہ کام آخر کیسے چلیں جو اس وقت اپنی حالت کو سدھارنے کے لیے شروع کیے گئے ہیں۔‘‘

قاضی جی : ’’اے صاحب تو کون مردود کہتا ہے کہ آپ کام نہ کریں۔ صابون بنانا سیکھیے۔ استانی گیری شروع کر دیجیے۔ آپ کو اختیار ہے جو جی چاہے کیجیے۔ اگر آپ کے بیچ میں بولوں تو جو چور کی سزا وہ میری مگر ان کو بخش دیجیے یہ پہلے میری ہی خدمت کر لیں پھر ملک وقوم کی خدمت کریں گی۔ یعنی حال یہ ہے کہ صبح سے بیٹھا مکھیاں مار رہا ہوں اور بیوی صاحبہ غائب۔ دودھ والا آیا میں نے کہا بھیا میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ گھر والی پر کیا گذری۔ مہترانی آئی۔ خدا جانے اپنی زبان میں کیا سمجھا

بجھا کر چلی گئی۔‘‘

بیوی : ’’خیر سو باتوں کی ایک بات یہ کہ تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں وہاں نہ جایا کروں۔‘‘

قاضی جی : ’’لیجیے اب میرے سر یہ الزام لگنے والا ہے۔ میں نے آپ کو کب روکا ہے۔ اب آپ یہ کہلوانے والی ہیں تمام دنیا سے کہ بیوی کو باندھ کر قید کر رکھا ہے کہیں آنے جانے نہیں دیتے۔ عورتیں سنیں گی تو کہیں گی کہ موا قصائی ہے۔ نگوڑ مارا جلاد ہے۔ صاحب یہ باتیں شوہر نہیں کہا کرتے بلکہ بیویوں کو ان باتوں کا خود خیال ہونا چاہیے کہ صاحب گھر پر جو ہمارا شوہر پڑا ہوا سوکھ رہا ہے اس کمبخت کا اگر اکیلے دو کیلے دم نکل گیا تو شربت فالسہ، فالسہ نہیں بلکہ انار حالانکہ مجھ کو فالسے کا شربت زیادہ پسند ہے بہرحال تو مطلب یہ کہ شربت کی بوند تک حلق میں ٹپکانے والا کوئی نہ ہوگا۔ آپ وہاں صابون بناتی رہ جائیں گی اور ہم چل بسیں گے۔‘‘

زبیدہ : ’’اللہ نہ کرے۔ یہ آپ نے عورتوں کی طرح کوسنا کاٹنا کہاں سے سیکھ لیا ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’عورتیں صابون۔ کریم۔ اسنو۔ فنائل سب کچھ بنانا سیکھ لیں اور میں یہ بھی نہ سیکھوں۔‘‘

بیوی : ’’خاک سیکھیں گی عورتیں جب مردوں کا یہ حال ہوگا جو تمہارا ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’بس بگڑ گئیں۔ تم کو تو مجھ سے بگڑنے کے لیے ایک بہانہ چاہیے۔ ہوتا ہے صاحب۔ عجیب مصیبت ہے یا تو ان کو اجازت دے دی جائے کہ جاؤ بیوی تم صابون بناتی پھرو اور خاندان کا نام روشن کرتی پھرو

ورنہ بگڑی جاتی ہیں۔ بولوں تو مصیبت۔ نہ بولوں تو مصیبت سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ جس شخص کا زور اپنی بیوی پر بھی نہ چل سکے اس کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ بے حیائی کی زندگی لعنت ہے اس زندگی پر اور تو میں کیا کہوں۔''

(۱۶)

(اجمل دروازے پر دستک دیتے ہیں)

اجمل : ''میں حاضر ہو سکتا ہوں؟''

بیوی : ''(اندر سے) کون اجمل بھائی؟ آجایئے نا۔

اجمل : (آتے ہوئے) ''آداب عرض بھابی۔ خیریت تو ہے؟ معاف کیجیے گا آپ کا پرچہ مجھے دیر سے ملا۔ آخر قصہ کیا ہے؟''

بیوی : ''کیا بتاؤں اجمل بھائی۔ دو دن سے آپ کے بھائی صاحب اٹوائی کھٹوائی لیے پڑے ہیں۔ آپ ہی خفا ہو گئے نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔''

اجمل : ''ارے؟ مگر کوئی بات تو ہوئی ہوگی ضرور۔''

بیوی : ''آپ جانتے ہیں کہ ان کو بے بات پر بھی بگڑنا آتا ہے پھر ناحق آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ اُن ہی سے پوچھ لیجیے کہ آخر مجھ سے ایسا کون سا گناہ ہو گیا ہے۔''

اجمل : ''تشریف کہاں رکھتے ہیں؟ اپنے کمرے میں؟''

بیوی : ''جی ہاں بس دو دن سے منہ لپیٹے پڑے ہیں۔ اللہ جانے دماغ کو روز بروز کیا ہوتا جا رہا ہے۔''

اجمل : ''اچھا آیئے میرے ساتھ، ابھی صلح ہوئی جاتی ہے۔''

(دونوں جاتے ہیں۔ قاضی جی کے کراہنے کی آوازیں قریب آتی ہیں)

بیوی : ’’یہ اجمل بھائی آئے ہیں۔‘‘

اجمل : ’’آداب بجالاتا ہوں۔‘‘

قاضی جی : ’’آداب عرض تشریف رکھئے۔‘‘

اجمل : ’’خیریت تو ہے، مزاج کیسا ہے؟‘‘

قاضی جی : ’’دم واپسیں برسرراہ ہے۔ عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے۔‘‘

اجمل : ’’اجی خدا نہ کرے۔ مگر کچھ معلوم تو ہو کہ بات کیا ہے آخر۔ مجھے تو اتفاقاً آپ کی علالت کی خبر ہوگئی۔‘‘

قاضی جی : ’’علالت؟ لیجیے اب یہ پروپگنڈا شروع ہوا ہے میرے متعلق کہ میں گویا علیل ہوں۔ ارے صاحب مجھ کمبخت کے ایسے نصیب کہاں کہ مجھ کو علالت یا موت وغیرہ پوچھیں۔ میں تو اسی طرح ایڑیاں رگڑنے کے لیے زندہ ہوں اور زندہ رہوں گا جب تک مقدر میں یہ ذلتیں لکھی ہوئی ہیں۔‘‘

اجمل : ’’خدانخواستہ آپ کی کس نے ذلت کی آخر؟‘‘

قاضی جی : ’’ذلت کرنے کی کسی اور کو کیا ضرورت ہے۔ اللہ رکھے ہماری بیگم صاحبہ کو جب تک ان کے دم میں دم ہے اس معاملہ میں کسی اور کا میں گویا شوہر یعنی میرا مطلب یہ کہ اس معاملہ میں کسی اور کا محتاج نہیں ہوسکتا۔ اس گھر میں ایک پھٹے ہوئے جوتے کی عزت ہوسکتی ہے مگر میری نہیں۔ مہتر تک معزز ہوسکتا ہے مگر میں نہیں۔ مجھ سے تو گویا پٹی داری ہے للّٰہی بغض ہے۔ بیر باندھ رکھا گیا ہے۔‘‘

اجمل : ’’آخر واقعہ کیا ہے؟‘‘

قاضی جی : ’’عرض تو کر رہا ہوں بھائی جان کہ بس ضدم ضدا ہے۔ میں کہوں کہ دن ہے وہ کہیں گی رات ہے۔ میں کہوں رات ہے تو وہ کہیں گی دن ہے۔ پھر یہ کہ اگر میں ان کی خوشنویسی، یعنی خوشدامنی، لاحول ولاقوۃ، میرا مطلب یہ ہے کہ خوشنودی جی ہاں خوشنودی۔ تو گویا خوشنودی۔ یہ خوشنودی کا ذکر کس بات پر چلا تھا۔‘‘

اجمل : ’’آپ بھابی کے متعلق فرما رہے تھے کہ کچھ کہ میں اگر دن کو دن کہوں تو یہ رات کہدیں گی اور اگر ان کی خوشنودی۔‘‘

قاضی جی : ’’جی ہاں پھر اگر ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے میں یہ عرض کروں کہ واقعی دن نہیں ہے بلکہ بقول آپ کے رات ہی ہے تو آپ جھٹ میری ضد میں اس کے رات ہونے سے بھی انکار کر جائیں گی گویا ع

میں ہوا مسلماں تو وہ کافر مسلماں ہوگیا

مگر یہ تو غلط ہے مسلمان کیسے ہوسکتا ہے۔ نہیں ٹھیک تو ہے وہ تو مسلماں ہی ہوجائے گا ضد میں کافر تو میں۔ ہاں ٹھیک ہے۔ وہ کچھ یوں ہے کہ میں ہوا کافر تو وہ۔‘‘

اجمل : ’’کافر مسلماں ہوگیا۔ مگر کیا کوئی تازہ واقعہ پیش آیا ہے؟‘‘

قاضی جی : ’’کیا عرض کروں کلیجہ کھرچ رہا ہے۔ آنتیں ایک دوسرے کو کھائے جاتی ہیں۔ آواز تک نہیں نکلتی۔ بیان کیا خاک کروں گا۔

اجمل : ’’صاحب یہ غلط ہے۔ بھابی آپ فوراً قاضی جی کے لیے کچھا کھانے کو لائیے۔‘‘

قاضی جی : ’’جی نہیں۔ آپ کو میرے سر کی قسم یہ نہ کیجیے۔ اب تو آب ودانہ چھوٹ

ہی چکا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کہاں تک نہیں مرتا ہوں۔ آپ کو میری قسم اجمل صاحب ذرا قلب کی حرکت ملاحظہ کیجیے۔ ہاتھ لائیے ذرا۔ یہ۔ یہ۔ ہاں یہاں ہاتھ رکھئے۔‘‘

اجمل : ’’ایں۔ یہ کیا! یہ کیا چیز ہے؟ بسکٹ کا بنڈل۔‘‘

بیوی : ’’بسکٹ کا پیکٹ کہاں سے آ گیا۔ یہ تو الماری میں رکھا ہوا تھا۔‘‘

قاضی جی : ’’میں کیا جانوں کہاں سے آ گیا کمبخت۔ اب گویا مجھ پر یہ شبہ بھی ہوگا کہ میں گویا فاقے کے بہانے سے لحاف کے اندر ہی اندر بسکٹ کھا رہا تھا۔ آج تک میں نے کھانے پینے کی چیز کی کبھی چوری نہیں کی ہے۔ اب بوڑھاپے میں یہ بھی گویا قسمت میں لکھا تھا کہ بسکٹ کھانے کی چوری لگے مجھ پر۔ واہ ری تقدیر۔‘‘

بیوی : ’’خواہ مخواہ کی باتیں کرتے ہو۔ چوری کون لگا رہا ہے۔ اور فرض کرلو کہ کھائے بھی تم نے بسکٹ تو کسی اور کے تو نہیں تمہارے ہی تو تھے۔ اپنی چیز کی چوری کرتے میں نے کسی کو نہیں سنا۔‘‘

قاضی جی : ’’یہ۔ یہ اس فرض کرلو کا مطلب میں خوب سمجھتا ہوں۔ مطلب یہ ہوا کہ گویا میں نے فاقے کی گویا محض دھمکی دے رکھی ہے اور میں چھپا چھپا کر بسکٹ کھا رہا ہوں۔ بس اب حد ہوگئی۔ اب تو خدا مجھ کو واقعی اٹھالے۔ آپ کو واللہ اجمل صاحب ذرا اس پیکٹ کا ایک بسکٹ چکھ کر دیکھئے اس قدر چراہند ہے کہ کوئی آدمی زبان پر نہیں رکھ سکتا۔ ایک بسکٹ منہ میں رکھا ہی تھا کہ کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ ایسے بسکٹ اگر میں کھانا بھی چاہتا تو بھلا کیسے کھا سکتا تھا؟‘‘

اجمل : ’’(ہنس کر) خیر ختم کیجیے اس قصہ کو قاضی جی۔ مگر معلوم تو ہو کہ اس

بھوک ہڑتال کی آخر وجہ کیا ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’اے صاحب ہماری ان بیگم صاحبہ گویا میری ان۔ ان۔ ان مختصر یہ کہ بیوی صاحبہ کا کچھ طریقہ یہ ہوگیا ہے کہ ہر معاملہ میں میری مخالفت اپنے اوپر فرض کر رکھی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مہاجرین کی یہ کس قدر طرفدار ہیں۔ حد یہ ہے کہ اپنے شوہر، اپنے سرتاج یعنی اپنے مجازی خدا گویا مجھ کمبخت کے مقابلہ میں بھی غیر سے غیر مہاجر کی طرفداری ہمیشہ کیا کرتی تھیں اور میں جلا کرتا تھا۔ مگر جتنا تھا تو جلوں۔ ان کی جوتی گویا پاپوش یعنی سلیپر کی نوک سے۔ یہ اپنی طرفداری سے کبھی باز نہ آئیں۔ اب خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جنگل بیابان آدمی نہ آدم زاد۔‘‘

اجمل : ’’یہ آپ کیا فرمانے لگے۔‘‘

قاضی جی : ’’میرا مطلب یہ ہے کہ اب خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ کراچی کے واقعہ کی اطلاع پا کر پہلی مرتبہ مجھ کو مسرت ہوئی اور پتہ چلا کہ صاحب یہ مہاجر بھی بڑے کام کی چیز ہیں۔ میں خوش خوش گھر آیا اور اُن سے کہا کہ لو بھئی مبارک ہو اب تو تمہارے عزیز از جان مہاجرین نے میرا دل بھی خوش کر دیا اور میں نے کراچی کا واقعہ سنا دیا۔ اے صاحب اِس واقعہ کا سننا تھا کہ گرگٹ کی طرح ایک دم بیگم صاحبہ نے رنگ بدل دیا، آگ بگولہ ہی تو ہوگئیں۔ اور چونکہ میں مہاجرین کا طرف دار ہوگیا تھا لہذا آپ مخالف ہوگئیں۔‘‘

بیوی : ’’ہائے میرے اللہ۔ تو تم اِس بات پر خفا ہو مجھ سے۔ سن لی آپ نے خفگی کی وجہ اجمل بھائی۔‘‘

اجمل : ’’کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ اِس بات پر اتنی ناراضگی کی کیا بات

تھی؟"

قاضی جی : "کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ بلکہ۔ بلکہ۔ خیر بلکہ کچھ نہیں یعنی محض کمال کرتے ہیں آپ۔ حضور والا اِس واقعہ سے مجھ کو معلوم ہوگیا کہ یہ نہ دراصل مہاجرین کی طرف دار ہیں نہ مہاجرین کی مخالف۔ ان کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ بس ہر رنگ میں میری مخالفت کی جائے۔ جب تک میں مخالف تھا یہ طرف دار تھیں۔ میں طرف دار ہوا تو یہ مخالف ہوگئیں۔ لہٰذا ثابت ہوا یعنی یہ بات ثابت ہوکر پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی کہ۔ کہ۔ مطلب یہ کہ بس ثابت ہوگئی یہ بات۔"

بیوی : "اجمل بھائی آپ ہی بتایئے کہ کراچی میں جو کچھ ہوا ہے۔ اُس پر سوائے شرم سے سر جھکا لینے کے اور کونسی گنجائش چھوڑی ہے اُن لوگوں نے جو اس واقعہ کے ذمہ دار تھے۔"

اجمل : "یہ تو آپ بالکل درست کہہ رہی ہیں۔ پاکستان کو اس قسم کی شرمناک ہنگامہ آرائیوں سے ہر طرح پاک ہونا چاہیے۔"

قاضی جی : "قیامت ہے صاحب۔ خدا کے واسطے یہ تو خیال کیجیے کہ میں اِس وقت فاقے سے پڑا ہوں۔ اس وقت بھی آپ کے لیے ان ہی کی طرفداری فرض ہے۔ گویا آپ دونوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ میری مخالفت ضرور کریں گے۔ میں پوچھتا ہوں کیا غلط ہوا کراچی میں؟ اُس طرف جو جگہ جگہ ہم مسلمانوں پر اِس سے گویا بدتر قسم کے ظلم۔ ظلم نہیں بلکہ مظالم ہو رہے ہیں تو ان کا جواب آخر کیسے دیا جاسکتا ہے۔"

بیوی : "وہاں جو کچھ ہو رہا ہے اُس کے ذمہ دار ہم نہیں۔ مگر یہاں جو کچھ ہوگا اُس کے ذمہ دار ہم ہیں۔"

اجمل : "دیکھیے قاضی جی اگر یہاں بھی وہی ہو جو وہاں ہو رہا ہے یا ہوا ہے تو وہاں میں اور یہاں میں فرق کیا رہ جاتا ہے؟ پاکستان کو ان گھٹیا قسم کے بدلوں سے، اِس غیر اِنسانی اور غیر اسلامی انتقام سے بلند ہونا چاہیے۔ یہ لوٹ مار، قتل، غارت ہماری شان سے گری ہوئی چیز ہے۔ ہم پاکستان کے ماتھے پر اس کو کلنک کا ٹیکہ سمجھتے ہیں۔"

قاضی جی : "استغفر اللہ۔ آپ تو لگے تقریر کرنے تو تالیاں بجانے لگوں میں۔ مگر میں تو یہ پوچھتا ہوں کہ یہ مہاجرین جو طرح طرح کے دُکھ اٹھا کر اپنا سب کچھ کھو کر یہاں آئے ہیں۔ جب یہاں بھی اپنے دکھ پہونچانے والوں کو دیکھیں گے تو کیوں کر مشتعل نہ ہوں گے۔ اب آپ ہی بتائے وہ کیا کریں۔"

بیوی : "ضبط کریں۔ صبر کریں۔ اور دنیا کو دکھا دیں کہ ہمارے پاکستان میں دوسروں کی بدسلوکیوں کا جواب بھی حسنِ سلوک سے دیا جاتا ہے۔"

اجمل : "فرض کر لیجیے کہ ہر ایک یہ نہیں کرسکتا ہے تو بھی قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا کسی کو حق نہیں۔ آپ کو معلوم نہیں قاضی جی کہ ان باتوں سے پاکستان کے وہ تمام وعدے خاک میں مل جاتے ہیں جو پاکستان کے ذمہ دار لوگ کر رہے ہیں۔ اور غیر ذمہ دار لوگ بغیر سمجھے بوجھے ایسی باتیں کر گزرتے ہیں۔"

قاضی جی : "یا تو آپ لوگ میری بات نہیں سمجھتے یا میں آپ کی بات نہیں سمجھتا۔ اے جناب میرے جو عزیز مارے گئے ہیں مثلاً میرے غالباً ماموں زاد بھائی یا شاید خالہ زاد بھائی۔ بہرحال میرے بھائی قاضی

عبدالرشید صاحب۔"

بیوی : "اللہ نہ کرے رشید بھائی مارے گئے ہوں۔ لو اور سنو ان کی خیریت کا خط تو کل ہی آیا ہے۔"

قاضی جی : "ارے صاحب سُنو تو سہی میں کب کہہ رہا ہوں کہ وہ خدانخواستہ مارے گئے۔ میرا مطلب تو یہ ہے کہ ان بھائی عبدالرشید صاحب کے برادرِ نسبتی یعنی بہنوئی نہیں بلکہ سالے۔ یا شاید بہنوئی۔ بہر حال اُن ہی میں سے کسی کو مار ڈالا گیا۔ اب آپ بتائیے کہ میں صبر کیوں کر کر سکتا ہوں؟ میرا تو خون کھول رہا ہے اور اوپر سے دیئے جا رہے ہیں مجھ کو فاقے پر فاقے۔"

بیوی : "ہائے اللہ کئی مرتبہ خوشامد کی ہے کہ کھانا کھالو۔"

قاضی جی : "بس رہنے بھی دو۔ اگر واقعی کھلانا ہوتا تو اپنی جان کی قسم دے کر نوالہ منہ میں دیدیتیں۔ اب میں ایسا بھی بد اخلاق نہ تھا کہ انکار دیتا۔"

اجمل : "اچھا یہی سہی بھابی۔"

بیوی : "اچھا لو تمہیں میری قسم یہ بسکٹ کھالو۔ جب تک میں کھانا لاتی ہوں۔ لو کھالو بسکٹ۔"

قاضی جی : "ارے صاحب یہ بسکٹ میں قیامت تک نہیں کھا سکتا۔ نہایت بدمزہ ہیں۔ دیکھ چکا ہوں کھا کر۔ تم کھانا ہی لا کر قسم دلاؤ۔ میں جب تک کلّی کر لوں۔"

(۱۷)

(قاضی جی داخل ہوتے ہیں)

قاضی جی : "ارے بھئی میں نے کہا سنتی ہو۔ تم آپا نصرت کے لڑکے امین میاں کے تو سامنے آتی ہو نا۔"

بیو : "لو اور سنو اب کیا میں بھانجوں بھتیجوں سے بھی پردہ کروں گی؟"

زبیدہ : "بھائی جان آپ نے بھی غضب کیا۔ اپنے گھر کے بچوں کے سلسلہ میں بھی پردے اور بے پردے کا سوال ہوا کرتا ہے کہیں۔"

قاضی جی : "استغفراللہ بات تو پوری کرنے دیا کرو۔ میرا مطلب یہ تھا کہ خود امین میاں ہوتے تو یہ سوال پیدا نہ ہوتا۔ جن صاحب کے متعلق میں الجھن میں پڑ گیا ہوں وہ واقع ہوئے ہیں ان حضرت کے کچھ سسرالی رشتے دار۔ یعنی امین میاں کے خسر تھے کوئی۔ یہ شاید ان ہی کے لڑکے ہیں۔"

بیوی : "شاید ان ہی کے لڑکے ہیں؟ یہ کیا بات ہوئی۔ پوچھ لیتے نا ان سے۔"

قاضی جی : "پھر وہی حماقت کی بات۔ یعنی وہ کہہ رہے ہیں کہ تمہارا عزیز ہوں۔ قریبی عزیز ہوں بلکہ رشتے داری جتانے کے شوق میں مجھ کو خالو ابا تک کہنے لگے۔ اور میں ان سے گویا یہ پوچھنے بیٹھ جاتا کہ بھئی تم سچ سچ

بتاؤ کس کے لڑکے ہو۔ مجھ سے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ میں ایسی بے مروتی کروں۔''

زبیدہ : ''اس میں بے مروتی کی کون سی بات ہے؟ مگر آپ کو خالو ابا کون کہہ سکتا ہے۔''

قاضی جی : ''کہنے کو کیا ہوا۔ اس میں نہ اس بیچارے کا کوئی قصور ہے نہ میرا۔ یہ جس کسی کی بھی خالہ بن جائیں اس کا مجھے خالو ابا ہونا ہی پڑے گا۔'

بیوی : ''ارے ہاں سچ تو ہے محمود ہوگا۔ بانو باجی کا لڑکا بانو باجی ہی کی لڑکی رضیہ کی شادی تو ہوئی ہے امین کے ساتھ۔''

زبیدہ : ''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ محمود ہی ہو سکتے ہیں۔ تو بلا لیجیے نا ان کو۔''

قاضی جی : ''یہ غلط ہے۔ انکل پچو تو آپ لوگوں نے ان کو بوجھا ہے اور جو لاکر سامنے کر دیا میں نے ان کو اور نکلے وہ کوئی اور تو خواہ مخواہ ذلیل ہونا پڑیگا مجھ کو۔ پہلے آپ لوگ جھانک کر دیکھئے ان کو اچھی طرح۔ جب اچھی طرح پہچان لیجیے گا تو میں غور کروں گا۔ غور تو خیر کیا کروں گا بس ان کو بلالوں گا اندر۔''

زبیدہ : ''جایئے بھابی جان آپ دیکھ لیجیے۔''

قاضی جی : ''ویسے یہ لڑکا صورت سے نہایت بدھو معلوم ہوتا ہے۔ یعنی اس میں جھوٹ بولنے اور چالاکی کرنے یعنی چکمہ دینے والی جو ایک بات ہوتی ہے گویا ذہانت اس کا کہیں چہرے پر پتہ ہی نہیں۔ کچھ عجیب جنگلی سا معلوم ہوتا ہے۔''

بیوی : ''اے محمود۔ واہ بھیا واہ۔ یہ آخر باہر تم کیوں کھڑے ہو۔ لو اور سنو کیا اب تم سے پردہ ہوگا۔''

محمود : ''آداب عرض خالہ جان۔ تسلیم زبیدہ خالہ۔''

قاضی جی : ''میں نے تم کو بہت چھوٹا دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ اب تم کچھ بڑے ہو گئے ہو۔''

بیوی : ''بانو جی تو اچھی ہیں؟ دولہا بھائی تو خیریت سے ہیں؟''

قاضی جی : ''بہت ہی بدل گئے ہو تم۔ ایک تو مونچھیں نکل آئی ہیں۔ دوسرے نصیب دشمناں شاید چیچک بھی نکل آئی ہے ورنہ جب میں نے تم کو بھوپال میں دیکھا تھا اس وقت تمہارا یہ حال نہ تھا۔ شاید پڑھتے تھے تم کسی جماعت۔ میں بغل میں بستہ، بستے میں کتابیں احسان بھائی کی انگلی پکڑے۔''

بیوی : ''لو اور سنو۔ ان کو بھوپال سے کیا تعلق وہ احسان بھائی کا لڑکا تھا خالد۔''

قاضی جی : ''اچھا تو یہ وہ نہیں ہیں۔ تو خیر۔ مگر یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ میں نے ان کو نہ دیکھا ہو پہلے۔ مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ یہ صورت میں نے دیکھی ضرور ہے۔ بہرحال اب کیا کرتے ہو برخوردار یعنی کیا مشغلہ ہے؟ مشغلہ تو خیر ہوگا کچھ، مطلب ہے کہ کرتے کیا ہو اب۔''

محمود : ''ابھی تو چلا ہی آ رہا ہوں۔ اب یہاں غور کرنا ہے کہ کیا کرنا چاہیے۔''

بیوی : ''مگر بھیا تمہارا تو کارخانہ تھا تمباکو کا۔''

قاضی جی : ''تھا تو سب ہی کچھ وہی مثل کہ پدرم سلطان بود۔ نہیں سمجھیں؟ یہ ایک فارسی کی مثل ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ پدرم میرے باپ یعنی تمہارے خسر۔ مگر تم سے کیا مطلب اور نہ مجھ سے مطلب ہے۔ یہ تو ایک کہاوت ہے کہ میرے باپ بادشاہ تھے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ

وہ مرحوم تو خیر بادشاہ تھے مگر آپ کیا ہیں۔ گویا تمباکو کا جو کارخانہ تھا وہ تو تھا۔ سوال تو یہ ہے کہ اب کیا ہے؟''

زبیدہ : ''مطلب یہ ہے کہ یہاں بھی وہی کام کریں گے جو کرتے تھے۔''

قاضی جی : ''خواہ مخواہ بھی کریں گے وہی کام۔ اب کہاں سے لائیں گے وہ سامان۔ نہ یہاں کارخانہ بنے گا نہ ان کا کام چل سکے گا۔ نہ نومن تیل ہوگا نہ رادھا ناچیں گی۔ ان کو تو یہاں کے مطابق کوئی چلتا ہوا کام سنبھال لینا چاہیے۔ مثلاً...... مثلاً اگر یہ کچھ روپیہ لگا سکیں تو میری رائے یہ ہے کہ ہوٹل کھول لیں ایک۔''

محمود : 'جی؟ ہوٹل۔''

بیوی : ''تم ان کو کہنے دو۔ ہوٹل نہیں تو اسپتال کھول لیں۔ جس کام کا تجربہ نہیں ہے وہ آخر کیسے شروع کر دیا جائے۔''

قاضی جی : ''صاحب یہ تو بڑی مشکل ہے کہ آپ اب بزنس میں بھی ٹانگ اڑانے لگی ہیں۔ قیامت تک تو یہ صاحبزادے تمباکو کا کارخانہ کھول نہیں سکتے۔ رہ گیا ہوٹل اس کا مشورہ میں نے اس لیے دیا تھا میرا خود اسی کاروبار کا ارادہ ہو رہا ہے۔''

زبیدہ : ''بھائی جان آپ کو ہوٹل کا کیا تجربہ ہے؟ دوسرے آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ شرکت کا کوئی کام کرنا بھی پسند کریں گے۔''

قاضی جی : ''جناب والا ساجھے کی ہانڈی ہمیشہ چوراہے پر پھوٹتی ہے۔ مگر لاحول ولاقوۃ یہ تو میں الٹی بات کہہ گیا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ یہ زمانہ اب اکیلے کام کرنے کا نہیں ہے۔ رہ گیا ہوٹل کے کام کا تجربہ تو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ جو شیخ صاحب کا ہوٹل ابھی ٹوٹا ہے، وہ میرے ہی مشورے سے کھولا گیا تھا۔''

بیوی : ''تمہارے مشورے سے کھولا گیا تھا۔ جب ہی تو بند ہو گیا۔''

محمود : ''خالو ابا۔ بات یہ ہے کہ میں ایسا کوئی کام تو کرنا ہی نہیں چاہتا جس میں اپنا کوئی دخل نہ ہو۔ میری رائے تو یہی ہے کہ تمباکو کا بزنس یہاں بھی شروع کروں۔''

قاضی جی : ''آپ کی رائے نہایت خام ہے۔ یعنی اپنی اس رائے پر آپ جس قدر غور کرتے چلے جائیں گے اسی قدر اپنی ناتجربہ کاری پر آپ کو افسوس ہوتا چلا جائے گا۔ برخوردارِ من تمہارے اس خاکسار خالو ابا نے بھی دھوپ میں یہ بال سفید نہیں کیے ہیں۔ بلکہ یہ نزلے کا اثر ہے یعنی بہت ہی کم عمر سے بالوں کے سفید ہونے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اچھا اگر کوئی خضاب بنائیں ہم تم مل کر تو کیسی رہے؟''

زبیدہ : ''آپ آخر اپنا ذکر کیوں بیچ میں لے آتے ہیں؟''

بیوی : ''مان نہ مان میں تیرا مہمان۔''

قاضی جی : ''ارے صاحب سمجھا تو کرو بات۔ یہ ابھی بچہ ہیں۔ صاحبزادے ہیں۔ پردیس کا معاملہ ہے ان کے لیے مناسب ہے کہ کوئی آزمودہ کار، جہاندیدہ، تجربہ کار رہنمائی کے لیے ساتھ رہے۔ اس لیے ان کو اپنا سمجھ کر یہ مشورہ دے رہا ہوں۔ غیر ہوتے کوئی تو میں البتہ کہتا کہ بھئی جہنم میں جاؤ مجھ سے کیا مطلب۔ یہ تمباکو وماکو کا جھگڑا ان سے یہاں نہ سنبھلے گا۔''

محمود : ''میں نے تو اندازہ یہ کیا ہے کہ تمباکو کے لیے یہاں بہت میدان ہے۔''

قاضی جی : ’’میدان تو خیر بہت ہیں مگر کیا ہر میدان میں آپ کو تمباکو کی کاشت کی اجازت مل جاتی ہیں۔ کیا عقل مند ہیں آپ بھی۔ معاف کیجیے گا۔ دیکھئے میاں صاحبزادے یہ گر کی باتیں آپ کو ہر ایک نہیں بتا سکتا۔ ہوٹل کے کام میں اور تمباکو کے کام میں ایک موٹا سا فرق آپ کو معلوم ہے کیا ہے؟ کبھی جو آپ کو معلوم ہو۔ تمباکو صرف وہی لوگ کھاتے ہیں جو پان کھاتے ہوں اور پھر تمباکو کی حد تک پان کھاتے ہوں یعنی سب ہی تمباکو نہیں کھاتے مگر کھانا سب ہی کھاتے ہیں۔ یعنی ہوٹل سب کے مطلب کی چیز ہے۔ ہر وہ شخص جس کو بھوک لگتی ہوگی آپ کا گاہک بن سکتا ہے۔ لیکن تمباکو آپ ہر ایک کو نہیں کھلا سکتے۔‘‘

محمود : ’’مگر دیکھئے تو ہوٹل ہیں بھی تو کتنے اور تمباکو کا مشکل ہی سے کوئی کارخانہ نظر آئے گا۔ اگر یہاں لکھنؤ کی طرح کا ایک کارخانہ بھی کھول دیا جائے تو سب اسی طرف ڈھل پڑیں گے۔‘‘

بیوی : ’’محمود میاں تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہاں ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ جو جو اپنے کام کے ماہر باہر سے آکر پاکستان میں جمع ہوگئے ہیں وہ سب اپنے اپنے فن کو یہاں پروان چڑھائیں۔ تاکہ ہم کسی بات کے لیے باہر کے محتاج نہ رہیں۔‘‘

قاضی جی : ’’اچھا صاحب اچھا۔ آپ کو اختیار ہے۔ یہ آپ کے میکے والے ہیں۔ آپ کا جو جی چاہے ان کو پٹی پڑھائیں۔ تمباکو کا نہیں میری طرف سے یہ گانجا، چرس، افیون جس چیز کا چاہے کارخانہ کھول لیں۔ مگر جو آمدنی اس وقت ہوٹل میں ہوسکتی ہے وہ دنیا کے کسی کاروبار میں نہیں۔ پھر یہ کہ وہی مثل کہ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ تجارت کی تجارت اور ایک سے ایک نعمت محض نمک چکھنے کے بہانے کھانے کے لیے موجود ہے۔ بڑے سے بڑے رئیس کے دسترخوان پر وہ کھانے نہ ہوتے ہوں گے جو ایک معمولی ہوٹل والا کھا سکتا ہے۔ وہی مثل کہ خدا بادشاہ کا طوطا نہ کرے ہوٹل والے کی بلی کر دے۔‘‘

زبیدہ : ’’یہ مثل میں نے آج ہی آپ کی زبان سے سنی ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’ارے صاحب خدا جانے روا روی میں کتنی باتیں میں ایسی کہہ جایا کرتا ہوں کہ بڑے بڑوں کو نہ سوجھیں۔ مگر قسمت سے مجبور ہوں کہ ناقدروں کے ہاتھ میں پڑا ہوا ہوں۔ قدردانی تو جیسے دنیا سے اٹھ ہی گئی ہے۔ اگر یہی بات شاہی زمانے میں میرے منہ سے نکل جاتی تو موتیوں میں تول دیا جاتا۔ اور اب یہ حال ہے کہ بادشاہ تو درکنار بیوی صاحبہ ہیں وہ محض اس جرم میں کہ میں ان کا شوہر واقع ہوا ہوں۔ اتنا بڑا چغد مجھ کو سمجھتی ہیں کہ میری کوئی بات قبول گویا ہو ہی نہیں سکتی۔ دور دور سے لوگ مجھ سے مشورے لینے آتے ہیں۔ اور جس کے گھر کی میں مرغی ہوں وہ مجھ کو دال برابر نہیں سمجھتی۔‘‘

بیوی : ’’بس تم تو یہ چاہتے ہو کہ تمہاری ہر اوندھی سیدھی بات سن کر ہاں میں ہاں ملاتی رہوں۔ تب تم سمجھو کہ قدردانی ہو رہی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ وہ اپنا اچھا خاصا چلتا ہوا کام چھوڑ کر جس میں اتنی ترقی کر چکے ہیں تمہارے کہنے سے ہوٹل لیکر بیٹھ رہیں۔ ہوٹل تو سب ہی کھول سکتے ہیں مگر یہ کام سب نہیں کر سکتے۔ یہ ان کا فن ہے۔ اس سے یہ پاکستان کو فائدہ پہونچا سکتے ہیں۔‘‘

قاضی جی : ’’اے صاحب خدا کے واسطے کوئی بات بغیر پاکستان کے بھی کر لیا

کرو۔ گویا پاکستان جب تک ان کے کارخانے کا بنا ہوا تمباکو نہ کھائے گا وہ سرخرو ہو ہی نہیں سکتا۔ زبیدہ! ارے بھئی زبیدہ میں نے کہا سنا تم نے۔ پھر ایک عجیب بات کہہ گیا میں۔ تمباکو کی رعایت سے سرخرو یعنی اس کا منہ لال ہوتا ہے۔ لوگ اس قسم کی باتیں گھنٹوں بیٹھ کر سوچتے ہیں اور پھر بھی پلے نہیں پڑتا۔ یہاں بات سے بات پیدا ہونا گویا کوئی بات ہی نہیں۔ سچ کہتے ہیں شیخ صاحب وغیرہ کہ قاضی جی آپ تو بات بات میں شاعری کرتے ہیں۔''

بیوی : ''ان شیخ صاحب کے نام سے میرے آگ لگتی ہے۔ خود تو جیسے بڑے عقل مند ہیں جو دوسروں کو بیوقوف بناتے ہیں۔''

قاضی جی : ''یہ یہ آگ نہ لگے گی تو اور کیا ہوگا۔ وہ چونکہ میری تعریف کرتا ہے بیچارہ۔ میری قدر کرتا ہے غریب۔ میری ایک ایک بات پر جھوم جھوم اٹھتا ہے۔ ایک ایک سے میری تعریف کرتا ہے۔ لہٰذا آپ اس کی مخالف ہیں۔ اور یہ بیوقوف بنانے والی بات کیا کہی تھی جناب نے۔ خدا کی شان کہ اب گویا مجھ کو بھی لوگ بے وقوف بنائیں گے۔ یہ شوق صرف آپ ہی پورا کرتی رہتی ہیں۔ ویسے باہر اس خاکسار کی اب بھی یہ عزت ہے کہ ابھی پرسوں شیخ صاحب نے اپنے بہت سے دوستوں کو چائے پر مدعو کیا تھا۔ محض مجھ کو دکھانے کے لیے کہ یہ ہیں قاضی جی۔ اور ان سب نے بخدا یہی کہا کہ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھ کو دیکھ رہے تھے گویا میں کوئی عجوبہ ہوں۔''

بیوی : ''ہاں ہاں تو نہ جانے اس موئے شیخ صاحب نے تمہارے متعلق اپنے دوستوں سے کیا کہہ رکھا ہوگا۔''

قاضی جی : ''کہہ کیا رکھا ہوگا؟ یعنی کمال کرتی ہو تم۔ بھئی اس وقت اس غریب کا پیٹھ پیچھا ہے۔ اس نے میرے سامنے اپنے دوستوں سے کہا کہ اب نہیں پیدا ہوں گے اس قسم کے لوگ۔ یہ نمونہ بس ختم سمجھئے۔ تبرک ہیں تبرک ہمارے قاضی جی۔ اور تم کیا ہنس رہے ہو میاں صاحبزادے یہ عزت اور یہ ہردلعزیزی تمباکو کی دوکان پر بیٹھ کر پڑیاں باندھنے سے حاصل نہیں ہوتی اس کے لیے کھوپڑی میں دماغ کی ضرورت ہے۔''

محمود : ''بجا ہے۔ درست فرما رہے ہیں جناب۔''

قاضی جی : ''درست تو میں فرما رہا ہوں مگر ارادہ کیا ہے۔ وہی تمباکو کی حماقت یا ہوٹل۔''

محمود : ''ہوٹل تو صاحب میرے بس کا ہے نہیں۔''

قاضی جی : ''اچھا تو برخوردار پھر خدا حافظ۔ اس میں تمہارا قصور نہیں یہ خاندانی کج بحثی اور ضد ہے تمہاری۔ ان خالہ صاحبہ کا بھی یہی عالم ہے کہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر کیا مجال جو اپنی حماقت کی بھی اصلاح کریں۔ خیر تم جانو تمہارا کام۔ میں نے تو ایک نیک مشورہ دیا تھا مگر تم لوگ ٹھہرے بھینس کے خاندان سے جس کے آگے بین بجانا ہی بیکار تھا۔ لاحول ولا قوۃ۔ استغفر اللہ۔''

(۱۸)

(قاضی جی گھر میں داخل ہوتے ہیں)

قاضی جی : ''ارے بھئی آجاؤ نا اجمل صاحب تم کیوں رک گئے دروازے پر؟ کوئی وہ تم سے پردہ تھوڑی کرتی ہیں۔''

اجمل : ''نہ سہی پردہ پھر بھی چاہیے یہ کہ بغیر اطلاع کے اندر نہ جائیں۔''

قاضی جی : ''سبحان اللہ۔ یہ بھی کوئی کسی ڈپٹی کمشنر کا بنگلہ ہے کہ بغیر اطلاع کے اندر نہ جائیں۔ ارے صاحب اپنا گھر ہے۔ یہاں کیا تکلف جو کچھ موجود ہے وہ تم بھی کھالو۔ ارے ہاں۔ لیجیے بات سے بات پیدا ہونا اس کو کہتے ہیں۔ ارے بھئی میں نے کہا سنتی ہو جو کچھ تیار ہو فوراً لے آؤ اجمل صاحب بھی کھالیں گے۔ مگر ذرا جلدی کرو ہم دونوں کو ذرا نیلام میں جانا ہے۔''

بیوی : ''ابھی لائی کھانا تو تیار ہی ہے۔ جب تک ہاتھ دھولو۔''

(جاتی ہے)

قاضی جی : ''تو میں عرض کر رہا تھا اجمل صاحب کہ نیلام میں جانے کی عادت کچھ ہمیشہ سے پڑی ہوئی ہے اور مجھ کو تو عجیب وغریب چیزیں یعنی اشیاء نیلام میں مل جایا کرتی ہیں۔ مثلاً اب آپ سے کیا چوری ذرا یہ دانتوں کا چوکہ ملاحظہ کیجیے (دانت نکالتے ہیں) جی؟ اب ذرا غور

فرمایئے کجا میرا منہ کجا یہ دانت۔ مگر۔ مگر۔ لایئے بس اب لگالوں دانت۔''

اجمل : ''کمال کیا صاحب آپ نے۔ نیلام میں دانت خریدتے ہوئے میں نے آپ ہی کو دیکھا ہے۔''

قاضی جی : ''(دانت لگا کر) اور آپ کو حیرت یا تعجب ہوگا گویا آپ متحیر ہو جائیں گے یہ سن کر کہ جب میں دنداں سازوں کے پاس پلیٹ بنوانے گیا یعنی طشتری نہیں بلکہ دانتوں کی پلیٹ تو صاحب کسی نے سو روپے سنائے کسی نے سوا سو اڑائے۔ میں اسی فکر میں گھومتا ہوا نیلا گھر کی طرف جا پہونچا اور بارہ آنے میں یہ پورے بتیس دانت خرید لیے۔''

اجمل : ''وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ چوکہ آپ کے فٹ کیوں کر ہوا؟''

قاضی جی : ''بس تھوڑی بہت تکلیف کھانے میں اور بات کرنے میں دیتا ہے اگر میں خاموش رہوں تو کیا مجال کہ ایک دانت بھی ہل جائے۔ مگر غور تو کیجیے کہ کہاں سوا سو روپیہ اور کہاں بارہ آنے۔''

بیوی : (آتے ہوئے) کس چیز کے بارہ آنے؟''

قاضی جی : ''دانتوں کا ذکر کر رہا تھا کہ نیلام میں بارہ آنے کے مل گئے تھے۔''

بیوی : ''چلو ہٹو۔ مجھے ہمیشہ تمہاری اس بات سے گھن آتی ہے۔ معلوم نہیں کس مردے کے منہ سے دم نکلتے وقت نکالے گئے ہوں گے یہ دانت۔''

قاضی جی : ''خیر۔ خیر آپ کی بلا سے۔ میرا منہ قبرستان ہی سہی۔ آپ کھانا لایئے نا جلدی جلدی مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

بیوی : ''دیکھ نہیں رہے ہو تمہارے سامنے ہی تو دسترخوان چن دیا ہے۔ بسم

اللہ کرونا۔“

قاضی جی : ”کیا مطلب؟ یعنی روٹیوں کا ایک ڈھیر اور سالن کا بس ایک ڈونگا۔“

بیوی : ”بس اب ایک وقت میں ایک ہی چیز ملا کرے گی۔“

قاضی جی : ”لاحول ولا قوۃ۔ ارے صاحب مذاق کا یہ وقت کون سا وقت نکالا ہے۔ آپ نے یعنی وہاں نیلام شروع ہو جائے گا اور ہم رہ جائیں گے یہاں آپ کے ان چونچلوں میں۔ ہر بات موقع محل سے اچھی معلوم ہوتی ہے لائیے جا کر باقی چیزیں۔“

بیوی : ”واقعی بس اور کوئی چیز نہیں ہے۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ اب دستر خوان پر سات آٹھ قسم کے کھانے ہرگز نہ ہوں گے۔“

قاضی جی : ”چہ خوش۔ کچھ معلوم تو ہو کہ یہ آخر کس جرم میں آپ نے مجھ گناہگار بلکہ گنہگار کیسے میرا مطلب یہ ہے کہ مجھ ناکردہ گناہ کو یہ سزا دی ہے۔ اور سزا دینے کے لیے بھی گویا آج ہی کا دن رہ گیا تھا جب کہ ایک مہمان، خیر مہمان تو نہیں میرا مطلب ہے جب کہ ایک۔ جب کہ ایک۔ گویا جب کہ ایک اجمل صاحب بھی موجود ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پیسے جائیں گے۔“

بیوی : ”خیر مجھے اجمل بھائی کی اتنی فکر نہیں جتنی تمہاری ہے۔ وہ تو خود ہی سمجھتے ہوں گے کہ دستر خوان ایسا سونا کیوں ہے۔“

قاضی جی : ”جی اور کیا؟ ناسمجھ تو ایک میں رہ گیا ہوں کہ جناب کی اوندھی سیدھی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ اور میں تو کہتا ہوں کہ خدا مجھ پر وقت نہ ڈالے جب میں آپ کی باتیں بھی سمجھنے لگوں۔ دستر خوان پر آپ نے جھاڑو پھیر رکھی ہے اور فرماتی ہیں کہ میری سمجھ میں بات نہیں آسکتی۔ ایسی بات خدا نہ کرے کہ میں سمجھوں۔“

اجمل : ”خیر بسم اللہ کیجیے نا قاضی جی کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

قاضی جی : ”اے حضت کیا بسم اللہ کروں۔ اپنا سر۔ مجھے تو کھانا نظر آتا نہیں۔ یہ تو راتب کی ایک قسم ہوئی کہ ایک سالن پکا کر شوہر کے سامنے رکھ دیا کہ لے زہر مار کر۔ بندہ نواز بری عادت پڑی ہوئی ہے اس دستر خوان کی جس پر باوجود ان بیگم صاحبہ کی عملداری کے اس گئی گذری حالت میں بھی چار پانچ قسم کا کھانا ہوا کرتا تھا۔“

بیوی : ”اور میری عملداری سے پہلے ہوتا ہوگا کوئی بہتّر قسم کا کھانا۔“

قاضی جی : ”یعنی کمال کرتی ہیں صاحب آپ۔ خدا جانتا ہے صرف پندرہ قسم کے سالن ہوا کرتے تھے۔ جن میں سے اکثر میں چکھتا بھی نہ تھا اور پھر یہ کہ دالیں، اچار، مربے اور میٹھی چیزیں گویا الگ ہوتی تھیں۔ دستر خوان کے نام سے دوکان لگ جایا کرتی تھی سامنے۔ بھئی اجمل صاحب یقین جانئے گا کہ اسی میں باپ دادا کی ساری کمائی اڑائی۔ جب یہ بیاہ کر آئی ہیں تو میری بڑی بیوی کا یہ حال تھا...... مگر وہ کہاں؟ وہ تو مرچکی تھیں اللہ انھیں جنت نصیب کرے۔ بہر حال تو جب یہ بیاہ کر آئی ہیں تو کم ہوتے ہوتے پھر بھی پانچ چھ چیزیں تو ہوا کرتی تھیں دستر خوان پر۔“

اجمل : ”مگر قاضی جی ذرا اس بات پر تو غور کیجیے کہ اگر سب نے مل کر کفایت کی طرف توجہ نہ کی اور اپنے اخراجات نہ گھٹائے تو پاکستان کے پاس اتنا روپیہ کہاں ہے کہ سب کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔“

قاضی جی : ”لیجیے صاحب اب حد ہوگئی کہ پاکستان گویا حلق کا دربان بھی بن

گیا۔ آپ لوگوں نے ایک آسان نسخہ یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہر مرض کی دوا پاکستان۔ ہر بات کا جواب پاکستان۔ ہر عذر لنگ کی بیساکھی پاکستان۔ اوں؟ ارے بھئی پنسل ہے اجمل صاحب آپ کے پاس؟ کیا بات کہہ گیا ہوں اس وقت روانی میں۔ عذر لنگ کی بیساکھی۔ لایئے ذرا لکھ لوں ورنہ بھول جاؤں گا۔ ذرا غور کیجیے گا اجمل صاحب۔ جو شوہر باتوں ہی باتوں میں ایسے محاورے ایجاد کر لیتا ہو اس کے سامنے رکھا جاتا ہے ایک سالن کہ لے کمبخت نگل۔ ٹھونس۔ زہر مار کر۔''

بیوی : '' تم چاہے جو کچھ بھی کہو مگر اس وقت پاکستان کے ہر سمجھدار آدمی کا فرض ہے کہ وہ اپنے اخراجات گھٹائے اور اپنا ہاتھ روک کر پاکستان کی دولت میں اضافہ کرے۔''

قاضی جی : ''اخراجات گھٹائے یعنی خرچ کم کرے گویا اپنا پیٹ کاٹے۔ گویا جیب کاٹے۔''

اجمل : '' (ہنس کر) نہیں قاضی جی بس خدا کے واسطے یہی نہ کیجیے گا۔ جیب کاٹنا بہت ہی شرمناک جرم ہے۔''

قاضی جی : ''میرا مطلب یہ ہے کہ گویا اپنے حق میں خود اپنی جیب کاٹے۔ آج پاکستان کے لیے میرے کھانے میں کتر بیونت ہوئی ہے۔ کل فرمائیں گی ایک پائنچے کا پاجامہ پہنو۔ ایک آستین کی قمیص پہنو۔ دونوں پیروں میں سے ایک پیر کا جوتا پہنا کر دو یا دونوں پیر ایک ہی جوتے میں رکھ لو۔''

بیوی : ''بس یہ بے تکی باتیں کوئی ان سے لے لے۔ اب بتایئے اجمل بھائی اخراجات میں کمی کیوں کر ہو سکتی ہے جب واسطہ ہو ایسے لوگوں سے۔''

قاضی جی : ''لوگوں ۔۔۔؟ چلئے چھٹی ہوئی۔ اب گویا شوہر بھی لوگ ہونے لگا ہے۔ گویا اب شوہر کی حالت کچھ ناظرین کے قسم کی ہو گئی ہے۔ ارے بھئی اجمل ناظرین پر یاد آیا کہ آج کل یہاں ایک تھیٹر ہو رہا ہے۔ چلو نا کسی دن چل کر دیکھ آئیں۔ اس کے ایک اشتہار میں صاف صاف لکھا ہوا تھا کہ ناظرین باتمکین دیکھ کر بے حد خوش ہوں گے۔ تو گویا چلو ذرا خوش ہو آئیں۔''

اجمل : '' قاضی جی معاف کیجیے گا پہلے تو کھانا کھا لیجیے پھر کوئی پروگرام بنے گا۔ میرا تو بھوک کے مارے برا حال ہے۔''

قاضی جی : ''ہاں ہاں تو بسم اللہ ارے بھئی کھاؤ نا۔ یا رمدت ہو گئی تھیٹر دیکھے ہوئے۔ اب تو خدا جانے وہ ایکٹر بھی زندہ ہوں گے یا نہیں۔ بھئی خدا کرے زندہ ہوں۔ واللہ طبیعت خوش کر دیتے تھے۔ مجھ کو اس قدر شوق تھا تھیٹر کا کہ ایک مرتبہ میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ میں بھی نوکری کر لوں گا مگر۔ مگر۔ یعنی۔ استغفراللہ باتوں ہی باتوں میں آپ نے مجھ کو بھی اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا حالانکہ میں تو صاحب قیامت تک یہ کھانا کھا ہی نہیں سکتا۔''

اجمل : '' قاضی جی میں آپ سے کچھ عرض کروں گا تو آپ ناراض ہو جائیں گے۔ مگر اتنا کہے بغیر بھی میں نہیں رہ سکتا کہ اس معاملہ میں بھابی صاحبہ کا طریقہ بالکل درست ہے۔ اس وقت قومی طور پر اسی قسم کی کفایت شعاری کی ضرورت ہے۔''

قاضی جی : ''اے جناب میں بھی قومی طور پر بلکہ خاندانی طور پر مجبور ہوں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس دادا کا پوتا ہوں جس کے دستر خوان پر ہاتھی جھومتے تھے۔''

اجمل : ''جی؟ کیا فرمایا؟ دستر خوان پر ہاتھی جھومتے تھے۔''

قاضی جی : ''میرا مطلب یہ کہ دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے اور جس کے دستر خوان کی شہرت دور دور تھی۔ کوئی اچھا باورچی یا رکابدار شہر میں آتا تو پہلے دادا جان مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوتا اور نوکر رکھ لیا جاتا۔ صاحب جس دن ان کا انتقال ہوا ہے جنازے کے ساتھ کوئی ڈیڑھ سو تو صرف باورچی تھے۔ آپ اُس دادا کے اس ننگ خاندان پوتے سے یہ چاہتے ہیں کہ۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا چاہتے ہیں۔''

بیوی : ''ان کا زمانہ اُن کے ساتھ گیا۔ اور اگر وہ زمانہ اس طرح نہ گزرا ہوتا تو آج ہمارا یہ حال بھی نہ ہوتا۔ قوم پر جو ادبار ہے وہ اسی قسم کی عیش و عشرت کا نتیجہ ہے۔''

قاضی جی : ''شاباش۔ مرحبا۔ زندہ باد۔ اللہ نے وہ دن تو دکھایا کہ آج سعادت مند پوتے کی دلہن گویا ددیا خسر کو عیاش کہہ رہی ہے۔ میں آج تک گھریلو لڑائی جھگڑے میں تمہارے بزرگوں تک کبھی نہیں پہنچا۔ ہمیشہ ان کی عزت کی۔ ان کو اپنا بزرگ سمجھا۔ مگر آج بیگم صاحبہ نے اپنے جلے پھپھولے خوب پھوڑ لیے۔ کیا کہنا ہے۔ کس قدر خوش ہو رہے ہوں گے مرحوم و مغفور اپنی پوت بہو کی یہ سعادت مندی سن کر۔

اجمل : ''قاضی جی آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ بھابی کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا۔ وہ تو یہ کہہ رہی تھیں .....''

قاضی جی : ''حضت بس معاف کیجیے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میری بیوی کی زبان گویا مجھ سے زیادہ آپ سمجھتے ہیں۔ میں ٹھہرا اہل زبان ہر قسم کی بولی ٹھولی۔ محاورے اور استغفارے یعنی میرا مطلب ہے ہر قسم کے محاورے اور استعارے خوب سمجھتا ہوں۔ زباندانی کا دعوے آپ میرے سامنے نہیں کر سکتے۔ وہی مثل کہ ع دعویٰ زبان کا۔ دعویٰ زبان کا۔ مگر یہ تو لکھنؤ کے متعلق ہے۔ بہر حال مطلب یہ کہ میرے سامنے آپ زباندانی کا دعویٰ کریں یہ بھی اللہ کی شان ہے۔''

اجمل : ''میں خیر یہ دعویٰ تو نہیں کرتا۔ عرض صرف یہ کر رہا تھا کہ آپ غلط سمجھے۔''

قاضی جی : ''غلط کیسے سمجھا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ پندرہ برس سے لگا تار ان کا شوہر چلا آ رہا ہوں۔ اور اگر اب بھی میں ان کی بات غلط سمجھ سکتا ہوں تو گویا لعنت ہے مجھ پر اور خدا کی پھٹکار میری سمجھ پر۔ تو گویا آپ مجھ سے زیادہ ان کی بات سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً۔ گویا مثلاً کیا سمجھے تھے آپ؟''

اجمل : ''میں معافی چاہتا ہوں صاحب میں کچھ نہیں سمجھا۔ واقعی میں اپنی حدوں سے آگے بڑھ گیا تھا۔''

بیوی : ''آپ بھی کمال کرتے ہیں اجمل بھائی۔ ان کی بات پر بُرا ماننے آپ ہی کو دیکھا ہے۔''

قاضی جی : ''کیا مطلب؟ گویا میں پاگل ہوں۔ میرا دماغ خراب ہے۔ میں جانگلو ہوں کہ میری بات پر کوئی بُرا بھی نہ مانے۔ مگر میں نے بُرا ماننے کی کون سی بات کہی ہے۔ اگر کہی ہے تو بھئی میں معافی چاہتا ہوں۔

شرمندہ ہوں ۔ نادم ہوں ۔ گناہگار ہوں ۔ روسیاہ ہوں اور ۔ اور ۔ اور ۔ مختصر یہ کہ جو کچھ آپ سمجھیں وہ ہوں ۔ للّٰلہ معاف کر دیجئے ۔ ''

اجمل : '' توبہ ۔ توبہ میں ہرگز ناراض نہیں ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں ۔ آج ان باتوں میں آپ کا نیلام بھی گیا ۔ ''

قاضی جی : '' ایں ؟ نیلام ۔ نہیں صاحب نیلام ناغہ نہیں ہو سکتا ۔ کھانا ملے یا نہ ملے نیلام کی حاضری ضروری ہے ۔ جلدی چلیے صاحب دیر ہو گئی ہے ۔ ''

(۱۹)

(قاضی جی تشریف لاتے ہیں)

قاضی جی : '' ارے صاحب میں نے کہا یہ کیا واہیات ہے ۔ یعنی مجھ کو سرِ بازار رسوا کیا نا آخر آپ نے ۔ میں نے اپنا گھر سمجھ کر روپے منگائے تھے اور یہاں سے ٹکا سا جواب چلا گیا ۔ وہاں ایک قہقہہ پڑ گیا ۔ مجھ کو اپنے گھر پر اتنا بھی حق نہیں ہے ۔ لوگ جتنا جتنا مجھ پر ہنس رہے تھے اسی قدر مجھ کو پسینے آ رہے تھے مارے شرم کے ۔ بلکہ چھٹن خاں نے تو ایک قہقہہ لگا کر یہاں تک کہہ دیا کیا قاضی جی کی بیوی تھوڑی ہیں استانی ہیں ۔ ''

بیوی : '' خیر چھٹن خاں موئے کا کیا ہے ۔ گھر چلے تو اُس کی جوتی سے نہ چلے تو اس کی جوتی سے ۔ مگر مجھ کو تو آمدنی اور خرچ کا حساب رکھنا پڑتا ہے ۔ تم نے روپے منگائے تھے خواہ مخواہ کے لیے موزے خریدنے کے لیے میں پوچھتی ہوں آخر موزوں کی تمہارے پاس کون سی کمی ہے ۔ ''

قاضی جی : '' کمی بیشی کا سوال نہیں ۔ اتفاق سے سستے مل رہے تھے ۔ میرا تو خیال ہے کہ چوری کا مال تھا ورنہ اتنے اچھے ریشم کے موزے جن میں ڈبل ایڑی پنجہ ہو ، آج کل کہاں ملتے ہیں بیس روپے درجن ۔ پھر یہ کہ

ہر ڈزائن الگ، ہر رنگ الگ۔ میں نے کہا کہ لاؤ ہر جوڑے کے ساتھ کا ایک موزہ بھی ہو جائے گا، تو بیگم صاحبہ نے کہلوا بھیجا کہ میرے پاس ان باتوں کے لیے روپیہ نہیں دھرا ہے۔“

بیوی : ”ہاں تو کیا جھوٹ کہلوایا میں نے؟ میرے پاس واقعی گھر کے خرچ سے زیادہ روپیہ نہیں ہے۔“

زبیدہ : ”اس معاملہ میں مجھے بھائی جان کا اصول بے حد پسند ہے کہ ہر مہینہ گھر کے خرچ کا ایک حساب بنا لیا ہے۔ پھر چاہے دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے، کیا مجال جو ایک پیسہ زیادہ خرچ ہو جائے۔“

قاضی جی : ”حساب تو ہوا ان کا اور ضرور تمیں ٹھہریں میری۔ وہی مثل کہ۔ کہ۔ یعنی کچھ ایسی ہی مثل ہے کہ چمڑی جائے دمڑی نہ جائے۔ مگر یہ تو کچھ اور ہی بات ہو گئی۔ مگر خیر، یہی بات سہی۔ مطلب کہ چاہے میری عزت چلی جائے، مگر ان کی گرہ سے پیسہ نہیں نکل سکتا۔ ارے بھئی عزت آبرو سے زیادہ تو پیسہ نہیں ہو سکتا۔ اس وقت سوال موزوں کا نہیں تھا بلکہ میری عزت کا تھا۔ چھٹن خاں کے ایسے سڑیل آدمی نے درجن بھر موزے خرید ڈالے۔ اور تو اور نبّو صاحب کے ایسے ننّھے انسان نے کھٹ سے بیس روپے نکال کر ڈال دیئے اور بارہ جرابیں لے گیا۔ ایک ہم تھے کہ یتیموں کی طرح کھڑے ترسا کیے۔“

بیوی : ”ان لوگوں کی نہ کہو۔ زمانے بھر کے بے فکرے خدائی خوار۔ گھر میں نہیں دانے اماں چلیں بھنانے والی بات ہے۔ ان ہی ڈھنگوں کے پیچھے بال بچوں کو فاقے کراتے ہیں۔“

زبیدہ : ”بھائی جان اس بات پر تو آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ بھابی جان نے، نہ آپ سے کبھی خرچ کی تنگی کی شکایت کی، نہ کبھی قرض کی نوبت آنے دی۔“

قاضی جی : ”مگر صاحب، میں ان باتوں کا عادی نہیں ہوں اور نہ میری پرورش اس طرح ہوئی ہے کہ ایک ایک چیز کے لیے دل مار کر رہ جایا کروں۔ اللہ بخشے، دادا جان مرحوم کے زمانے میں تو یہ حال تھا کہ اگر کوئی سودا لینے کے لیے دس روپے کا نوٹ سودے والے کو دیدیا ہے تو باقی دام واپس لینا گویا ڈوب مرنے کی بات تھی۔ ابا جان کے وقت میں حالت اچھی نہیں رہی تھی مگر یہ مشہور بات ہے کہ والدہ صاحبہ مرحومہ، روپے کے پیسے گننا نہ جانتی تھیں اور ہزاروں روپیہ ان ہی کے ہاتھوں سے صرف ہوتا تھا۔“

بیوی : ”وہ میں سب جانتی ہوں، مگر یا تو گھر کا خرچ اپنے ہاتھ میں لے لو۔ اور اگر میرے ہاتھوں خرچ کروانا ہے، تو میں جو حساب لگا لیتی ہوں ہر خرچ کا، اس سے زیادہ میں فضول خرچیوں کے لیے ایک پیسہ بھی نہیں دے سکتی۔“

قاضی جی : ”پھر وہی فضول خرچی! کس مردود نے کی ہے کوئی فضول خرچی؟ ڈور کنکوا میں نہیں لاتا۔ ماچتورا میں نہیں ہوں کہ فالودے پیتا پھروں یاد ہی بڑے اڑاتا پھروں۔ ناٹک بائسکوپ وغیرہ کا مجھ کو شوق نہیں، کوئی نشہ میں نہیں پیتا، جوا میں نہیں کھیلتا۔ کسی اور رنگ میں تم جانتی ہو کہ میں نہیں ہوں۔ مگر اس وقت تو اپنی آن کا سوال تھا۔ سب نے مل کر طے کیا کہ ایک ایک درجن موزے سب لے لیں گے۔ مارے شان کے میں نے بھی لے لیے تھے۔“

بیوی : ’’اچھا اب تم ہی بتاؤ کہ بیس روپے جو میں تم کو بھیج دیتی تو اپنا حساب کیسے پورا کرتی؟ میں تو ایک ایک پائی کا حساب مقرر کرلیا کرتی ہوں، کہ اس مہینہ کی یہ آمدنی ہے اور یہ خرچ ہیں۔ خرچ آمدنی کے اندر ہی تو رہ سکتے ہیں۔‘‘

قاضی جی : ’’سبحان اللہ! گھر نہ ہوا اچھی خاصی سلطنت ہوگئی۔ جیسے سلطنتوں کے گویا بجٹ بنتے ہیں کہ اتنی آمدنی ہوگی، یہ خرچ ہوگا۔ اتنا بچے گا یا اتنا نقصان ہوگا۔ اور اس نقصان کو اس اس طرح پورا کیا جائے گا۔ معلوم نہیں کہ یہ حساب کتاب کی نحوست کیوں شروع کی گئی ہے گھر سے برکت اٹھانے کے لیے۔‘‘

زبیدہ : ’’کمال کرتے ہیں بھائی جان آپ بھی! یہ تو سلیقہ کی بات ہوئی۔ اس میں بھلا کیا نحوست ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’صاحب، اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ اس میں کیا نحوست ہے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ تم نے دیکھی ہی نہیں اپنے خاندان کی شان۔ تم تو اس وقت پیدا ہوئی ہو جب خلیل خاں فاختہ اڑا چکے تھے۔ ورنہ یہ واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ہمارے یہاں کی بی مغلانی نے دھوبی کو جو کپڑے دیے تو کہیں لکھنا شروع کر دیے تھے کہ ادھر سے آگئے والد صاحب قبلہ۔ ارے صاحب بس کچھ نہ پوچھیے زمین آسمان ایک کر دیا کہ میں لاکھ لٹ گیا ہوں۔ لاکھ دولت نے منہ موڑ لیا ہے، مگر میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اب دھوبی تک کو لکھ لکھ کر کپڑے دیے جائیں۔‘‘

بیوی : ’’اوئی اللہ۔ آخر اس میں کیا ہرج ہے؟‘‘

قاضی جی : ’’ہرج یہ تھا کہ رؤسا میں ہمیشہ اپنی پرجا، مثلاً دھوبی، بہشتی، بھنگی، نوکر

چاکر وغیرہ کو اس کا موقع ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر دیا جاتا تھا کہ وہ بھی اپنا کسی نہ کسی طرح بھلا کر لیں۔ یعنی اگر دھوبی بیچارے کچھ کپڑے رکھنا چاہتا ہے تو شوق سے رکھ لے، اس کو گویا اس کا حق سمجھا جاتا تھا۔ اور اس پر یہ ظاہر کرنا اپنی شان سے گری ہوئی بات سمجھی جاتی تھی کہ ایک ایک کپڑے پر ہمارا دم نکلا جاتا ہے۔ اور پھر برکت بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی علی الحساب دے رکھی تھی۔ آج کل کی طرح نہیں کہ جتنا پیسے کو دانت سے دبایا جاتا ہے، اتنا ہی پیسہ عنقا ہوتا جاتا ہے۔‘‘

زبیدہ : ’’تو کیا مطلب یہ ہے کہ اب بھی اُسی طرح آنکھ بند کر کے دونوں ہاتھوں سے اپنے کو لٹایا جائے۔؟‘‘

بیوی : ’’ان کا بس چلے تو دو دن میں گھر لٹا کر بیٹھ رہیں۔‘‘

قاضی جی : ’’اب گھر میں دھرا ہی کیا ہے لٹانے کے لیے؟ جیسی جیسی سب کی نیتیں خراب ہوئیں، ویسی ویسی حالت بگڑتی گئی۔ بھلا غضب خدا کا، تم اس ساس کی بہو ہو جس کو بیس تک گنتی آتی تھی۔ بائیس کہنا ہوا تو دو اوپر بیس کہہ کر مطلب پورا کر دیا۔ چالیس کہنا ہوا تو دو بیسیاں کہہ دیں، اور بہو صاحبہ ہیں کہ حساب کتاب کے کھاتے کھولے ہوئے ہیں۔ پائی پائی کا حساب آپ سے لے لیجیے۔ سودے والوں سے ایسا حساب زبانی کر جاتی ہیں کہ میں تو لکھ کر بھی گھنٹوں نہ کر سکوں۔‘‘

بیوی : ’’یہ نہ کرتی ہوتی تو بوٹی بوٹی قرض میں بندھ چکی ہوتی۔ تھوڑا بہت حال تو میں نے بھی دیکھا ہے تمہارے یہاں کا، کہ مہینہ کی پندرہ تاریخ تک آمدنی سے اور پندرہ کے بعد قرض سے گھر کا خرچ چلا کرتا تھا۔‘‘

قاضی جی : ’’ہاں تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ قرض نہیں لیا جاتا تھا۔ اور نہ

صاحب، ہمارے زمانے میں قرض کوئی ایسی بری بات تھی۔ رؤسا کی پہچان ہی یہ تھی کہ وہ مقروض ہوں۔ یہ تو میں نے جناب کے عہد حکومت میں سنا ہے کہ قرض گویا کوئی نہایت شرمناک چیز ہے۔ ہمارے یہاں تو قرض اس لیے لیا جاتا تھا کہ دوسروں کے سامنے کوئی شرم نہ آئے کسی موقع پر۔''

زبیدہ : '' آخر اسی قرض کے بدولت سب کچھ کھودیا اور ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ رہے۔ کاش وہ دور اندیشی، جو بھابی جان کر رہی ہیں اماں جان یا دادی جان نے کرلی ہوتی۔''

قاضی جی : ''مطلب یہ کہ آپ کی بھاجی جان کے دم قدم سے جو قحط سالی اب شروع ہوئی ہے، وہ اسی وقت سے شروع ہوجاتی۔ مگر اماں جان یا دادی جان کے واسطے یہ ممکن ہی نہ تھا۔ وہ نہ ایسی کنگلی تھیں اور نہ ہوسکتی تھیں۔ ارے صاحب، میری ہی شادی کا قصہ لے لیجیے۔ خیر، ان بیگم صاحبہ کے ساتھ تو میں نے ذاتی طور پر شادی کی ہے۔ یوں ہی چپ چپاتے بیاہ لایا تھا۔ مگر پہلی شادی جو ابا جان نے کی ہے، تو مہاجن نے والد صاحب سے دریافت کیا کہ قاضی جی، آخر کتنا روپیہ درکار ہوگا؟ والد صاحب نے جواب دیا کہ ہمارے خاندان میں اس قسم کے موقعوں پر گنتی سے کام نہیں لیا جاتا، بس جتنی جتنی ضرورت پڑتی جائے، تم برابر بھیجتے رہو۔''

زبیدہ : '' مگر نتیجہ کیا ہوا؟ بارہ دری آپ ہی کی شادی کے پیچھے مہاجن کی ہوگئی۔''

قاضی جی : ''وہ تو خیر ہوگئی۔ آج تک یاد ہے وہ تقریب سب کو۔ بارات تھی کہ اللہ اکبر، دو میل لمبا جلوس۔ خیر دو میل تو نہ ہوگا مگر دو فرلانگ میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ یعنی مجھ دولہا کے ہاتھی پر سے چاندی، سونے کے پھول اور روپئے جو لٹائے گئے وہ صرف پانچ ہزار تھے۔ ایک ہفتہ تک ناچ رنگ ہوتے رہے، دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کہہ تو دیا کہ آج تک اس تقریب کو دیکھنے والے موجود ہیں، اور اب تک عش عش کر رہے ہیں۔ خیر ہر وقت تو عش عش نہ کرتے ہوں گے، مگر جب یاد کرلیتے ہیں تو بیشک کرتے ہیں عش عش۔''

بیوی : ''خیر وہ میں سب سن چکی۔ یہ خوش ہونے کی باتیں نہیں رونے کی باتیں ہیں۔''

قاضی جی : ''بیشک رونے کی باتیں ہیں۔ یعنی بعد میں وہ سر پکڑ کر رونا پڑا ہے سب کو کہ میں کیا عرض کروں۔ یعنی اتنی دھوم سے تو ہوئی شادی کہ دو فرلانگ لمبا جلوس اور دلہن صاحبہ جو تشریف لاتی ہیں تو تپ دق میں مبتلا، تیسرا نہیں تو دوسرا درجہ ضرور تھا۔ بخار میں مبتلا، کھانسی کی ٹھوں ٹھوں، زرد رنگ، چمرخ بالکل۔ نتیجہ یہ کہ چل بسیں تھوڑے ہی دنوں میں۔ وہ تو کہو کہ خدا نے مجھ ہی کو بچالیا۔ ورنہ اگر ان کی بیماری لگ جاتی تو میں تم ہی کو بیوہ کر بیٹھتا۔ مگر نہیں بھئی، خدا نہ کرے شیطان کے کان بہرے۔''

زبیدہ : ''ایک تو اس طرح خرچ کرنا بلکہ روپیہ کو بہانا کسی وقت بھی جائز نہیں تھا۔ دوسرے تو اپنی ان ہی غلطیوں کی تلافی کا یہ وقت ہے۔''

قاضی جی : ''کیا؟ کیا؟ یعنی کیا فرما گئیں جناب؟ میرا تو اسی میں کافی ناطقہ بند رہتا ہے کہ میں آپ لوگوں کی گفتگو ٹٹولتا رہ جاتا ہوں۔ ایک سے ایک

جناتی الفاظ سن لیجیے ہماری مستورات سے۔ کس قدر قابل رحم ہے اس شخص کی حالت، جس کے گھر میں وہ زبان بولی جاتی ہو، جس پر بغیر کافی غور کے کچھ پلے پڑنا نہایت دشوار ہے۔ اب معلوم نہیں یہ غلطیوں کی تلافی کیا بلا ہوتی ہے۔“

بیوی : ”اب یہ تلافی بھی نہیں جانتے۔ جو سنے وہ بھی کیا کہے۔“

قاضی جی : ”ارے صاحب جانتا سب کچھ ہوں مگر اتنے دن ہو چکے ہیں یہ سب پڑھے ہوئے کہ اب ہر وقت خیال نہیں رہ سکتا ہے ہر لفظ کا۔ دماغ ہی تو ہے، کوئی پہیلیاں بوجھنے کی مشین تو ہے نہیں۔ ہاں تو کیا فرما رہی تھیں یہ عزیزہ؟“

زبیدہ : ”میں یہ کہہ رہی تھی بھائی جان کہ جتنا نقصان ہم لوگ اپنی ناسمجھیوں سے اٹھا چکے ہیں وہی بہت ہے، اب تو ہماری آنکھیں کھلنا چاہئیں۔ یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ اگر پہلے ہم کچھ غلطیاں کرتے چلے آئے ہیں تو اب بھی وہی غلطیاں کریں۔“

قاضی جی : ”یہ تو مجھ کو لکچر کا سا انداز معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے یہ عجیب سعادت مندی ہے کہ اپنے بڑوں کی غلطیوں پر ہم اس طرح نام دھریں۔ صاحبزادی، زبان سے چڑ چڑ بڑ کرنا دوسری بات ہے اور اپنی گھٹی میں ملی ہوئی ریاست کو بھول سکنا ایک دوسری بات ہے۔ میں نے تو اپنے بزرگوں کو اسی شان سے دیکھا کہ، وہ خواہ مقروض ہوئے یا کچھ، مگر اپنے بزرگوں کی آن میں فرق نہ آنے دیا۔ پیسے کو ہم لوگوں نے ہمیشہ ہاتھ کا میل سمجھا اور پیسہ صرف کر کے وہ نام حاصل کیا تھا، جو آج سر بازار آپ کی ان بھاوج صاحبہ نے بیس روپلّی کے لیے ڈبو کر، مجھ کو اس

قابل نہ رکھا کہ میں کسی کو منہ دکھا سکوں۔ لاحول ولاقوۃ پھر وہ کمبخت بات یاد آ گئی۔“

بیوی : ”میں نے نہ تمہارے خاندان کا نام ڈبویا ہے، نہ تمہاری عزت خاک میں ملائی ہے۔ میں نے یہ سب جتن تمہارا ہی گھر چلانے کے لیے کیے ہیں۔“

زبیدہ : ”معلوم نہیں بھائی جان آپ کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ اگر بھابی جان اس طرح حساب کتاب میں چوکس نہ رہیں، تو اس نازک زمانہ میں عزت آبرو اور شرافت کے ساتھ گھر کا چلنا ہی دشوار ہو جائے گا۔ آپ اس بات سے خوش ہو سکتے ہیں کہ یہ آپ کو مقروض کر دیں؟“

قاضی جی : ”کمال ہے صاحب! اے جناب، قرض آخر انسان ہی تو لیتا ہے۔ دوسرے قرض تو گیا جہنم میں، میرا سوال تو یہ ہے کہ آخر اس گھر میں یہ نئی باتیں کیا شروع ہو گئی ہیں حساب کتاب والی؟ آخر یہ گھر محکمہ کیوں بنتا چلا جا رہا ہے روز بروز؟ یہ کیا نحوست ہے کہ لکڑی کے لیے اگر بیس روپے رکھ لیے ہیں تو اکیس روپے کی لکڑی گویا نہیں آ سکتی۔ میں نے تو کبھی یہ حساب کتاب دیکھا نہیں تھا اپنے گھر میں۔“

زبیدہ : ”نئی باتیں اس لیے شروع ہو گئی ہیں کہ اب ہماری زندگی ہی نئے سرے سے شروع ہوتی ہے، اور جب زندگی ہی نئی شروع ہوتی ہے تو کیوں نہ اس کو باقاعدگی سے شروع کیا جائے۔ یہی ایک ایک گھر کی باقاعدگی مل کر ہمارے پاکستان کو باقاعدہ بنا سکے گی۔“

بیوی : ”اے ہے پاکستان کا نام نہ لینا، ورنہ ان کو ابھی اور غصہ آ جائے گا۔“

قاضی جی : ’’پاکستان کا نام بھلا کیسے نہ لیا جائے گا؟ پاکستان تو آپ لوگوں نے میری چڑھ مقرر کی ہے۔ گویا پاکستان اسی گھر سے ابلے گا، یا ہر طرف سے سمٹ سمٹا کر اسی گھر میں بند ہو گیا ہے۔ پاکستان نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ شوہر کو ایک درجن سستے موزے بھی نہ خرید نے دو۔ پاکستان نے یہ بھی کہا ہو گا کہ تم حساب کتاب کے رجسٹر کھولو اور اکاؤنٹنٹ بن کر بیٹھ رہو۔ یہ تمہارا پاکستان مجھے زندہ تھوڑی چھوڑے گا۔ دیکھ لینا میرا قبرستان بن کر رہے گا۔ میری جان سے دور۔ گویا نصیب دشمناں۔‘‘

(۲۰)

(قاضی جی خراٹے لیکر سو رہے ہیں۔
بیوی ان کو چائے کے لیے اٹھا رہی ہیں)

بیوی : ’’نیند نہ ہوئی، موئی آفت ہو گئی۔ دن چڑھ آیا، ناشتہ پڑا بھنک رہا ہے، چاء موئی ٹھنڈی ہو کر رہ گئی۔ اے میں نے کہا سنتے ہیں آپ۔‘‘

قاضی جی : ’’(انگڑائی لیتے ہوئے) اُونہہ۔ ہونہہ۔ بھئی لاحول ولاقوۃ۔‘‘

بیوی : ’’نہ اللہ کا نام نہ محمدؐ کا کلمہ۔ صبح صبح لاحول پڑھتے ہوئے اٹھتے ہیں۔ میں نے کہا، ذرا دیکھو تو کتنا دن چڑھ آیا۔‘‘

قاضی جی : ’’چڑھ آیا تو چڑھ آنے دو۔ میں کیا کروں! رات کو سویا بھی تو دو بجے تھا۔ کیسا عمدہ خواب دیکھ رہا تھا کہ گویا چھٹن خاں پر پیدل کی شہ پڑی۔ تو ان کے بادشاہ نے اپنا تخت چھوڑ کر مجھ سے کہا کہ قاضی جی، آج سے میں آپ کا غلام ہوں، آپ تخت پر جلوس فرمایئے۔ ایک دم سے گویا شطرنج کی بساط دربار کا بڑا سا دیوان عام بن گئی اور میں گویا شاہی لباس میں تخت کی طرف بڑھ رہا تھا کہ تم نے خواہ مخواہ جگا دیا۔‘‘

بیوی : ’’وہی مثل کہ بلی کو خواب میں بھی چھیچھڑ دکھائی دیتے ہیں۔ ساری رات موئی شطرنج کھیل کر سوئے، وہی نگوڑ ماری خواب میں بھی دیکھی۔

زبیدہ : اچھا اب اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لیجیے۔ چائے واقعی غارت ہو کر رہ گئی۔ آپ کا تو نہ کوئی سونے کا وقت ہے نہ جاگنے کا۔

قاضی جی : ''آپ لوگوں کا بس چلے تو میرے گلے میں ایک گھڑی باندھ کر لٹکا دیں کہ لو برخوردار، اب اس کی سوئیوں کے اشارے پر ناچتے رہو۔ گھر نہ ہوا جیل خانہ ہو گیا، جہاں قیدیوں کے لیے سونے جاگنے، کھانے پینے کے بگل اور گھنٹے بجا کرتے ہیں۔ نہ اپنی خوشی کوئی سو سکتا ہے نہ اپنی خوشی جاگ سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں آخر مجھ نامراد پر یہ روز بروز نئی نئی پابندیاں کیوں لگتی چلی جا رہی ہیں۔''

بیوی : ''پابندیاں کوئی بھی نہیں لگ رہی ہیں البتہ دل یہ ضرور چاہتا ہے کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہو جائے تو خود اپنی زندگی بھی باقاعدہ ہو جائے۔ نوکروں کو آرام ملے اور ہر کام بھی اپنے وقت پر ڈھنگ سے پورا ہو جائے۔''

قاضی جی : ''سبحان اللہ! اب گویا اس باقاعدگی اور اس ڈھنگ کے لیے ہم اپنے گھر میں بھی رنگروٹوں کی چھاؤنی والی حرکتیں شروع کر دیں۔ کہ صبح ہوئی اور کوئیک مارچ۔ شام ہوئی اور اٹینشن۔ اے صاحب، ہم رئیس ابن رئیس۔ آپ کیا سمجھ سکتی ہیں ہماری مزاجی کیفیت کو۔ یہ تو وقت کی بات ہے کہ آپ اپنی اس کرخت آواز کے ساتھ یوں بدتمیزی سے جگاتی ہیں، اور ہم جاگ اٹھتے ہیں۔ ورنہ ہمارے بزرگوں کے سرہانے نہایت خوشگلو گانے والیاں جب تک بھیرویں کی ایک آدھ چیز نہ گا لیتی تھیں، اس وقت تک ان کی آنکھ ہی نہ کھلتی تھی۔''

زبیدہ : ''اُسی زمانے کا بھگتان تو اب بھگت رہے ہیں، بھائی جان۔ مگر وہ زمانہ ان ہی بزرگوں کے ساتھ چلا گیا اور ہم کو تو وہ وقت یاد ہے، جس کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ اب اگر ہم نے اپنے کو وقت کے سانچے میں نہ ڈھالا تو وقت ہم کو چھوڑ کر گذر جائے گا اور ہم وقت سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔

قاضی جی : ''الاماں والحفیظ۔ معلوم ہوتا ہے جیسے کسی بہت مشکل کتاب نے خود بخود بولنا شروع کر دیا ہے۔ قسم لے لیجیے، جو ایک بات بھی سمجھ میں آئی ہو۔ میں تو حیران ہوں کہ یہ باتیں گھر کی بیٹھنے والی عورتیں سیکھتی کہاں ہیں۔ یعنی میں مرد ہو کر ٹاپتا رہ جاتا ہوں، جب تم لوگ قینچی کی طرح زبان چلاتی ہو۔ نیند کا خمار الگ ہے اور ذکر ہے ان چیزوں کا جو میرے باپ دادا نے بھی کبھی نہ سنی ہوں۔ کیوں صاحب، یہ وقت کا سانچہ کیا بلا ہے جس میں مجھ غریب کو ڈھالنے کی ترکیبیں ہو رہی ہیں۔''

بیوی : ''دنیا جہاں میں ہر بات کا ایک وقت مقرر ہے، مگر اس گھر کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ بھلا بتاؤ، اس وقت تک جب چائے کا بکھیڑا پھیلا رہے گا تو کھانے کا کون سا وقت آئے گا۔''

قاضی جی : ''صاحب باوا آدم نرالا ہو یا اماں حوا نرالی ہوں، مگر مجھ سے تو یہ ناممکن ہے کہ میں اپنی مرضی چھوڑ کر اس دن رات ٹکٹکانے والی گھڑی کا غلام بن کر بیٹھ رہوں۔ گھڑی ہم سے ہے، ہم گھڑی سے نہیں ہیں۔ تف ہے اس زندگی پر کہ اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے اس گھڑی کے اشارے پر ناچنا شروع کر دیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ دراصل جس کے پاس گھڑی نہ ہو، نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے راتیں اس کی

ہیں، تیری زلفیں مگر زلفیں کہاں؟ یعنی مجھ سے تیل منگا کر محض طاق پر رکھ دیا ہے یا کبھی لگاتی بھی ہو۔

زبیدہ : ’’سچ مچ تماشے کی باتیں کرتے ہیں آپ بھائی جان۔ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں آپ بھی۔‘‘

قاضی جی : ’’اس سلسلہ میں تو کل سے پوچھنا چاہتا تھا۔ چھٹن خان کی بیوی کے بالوں کا تو یہ حال تھا کہ گویا تیرتھ یاترا سے فارغ ہو کر، صفا چٹ بنی بیٹھی ہیں، مگر اس تیل سے یکا یک پھر بال اُگ آئے اور اب اگر موباف باندھ لیں تو بالکل چوٹی نظر آتی ہے دور سے۔ میرا مطلب یہ کہ بڑا مفید ہے یہ تیل۔‘

بیوی : ’’تیل گیا چولھے میں۔ چائے بھی اب پی جائے گی یا اٹھوا دوں۔‘‘

قاضی جی : ’’لیجیے صاحب، تیل گیا چولھے میں اور بھڑک اٹھیں جناب۔ زبیدہ سن رہی ہو میرا اندازِ گفتگو۔ کبھی کبھی انداز آ جاتا ہے ابا جان والا۔ وہ بھی بات سے بات پیدا کرنے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ آج اگر زندہ ہوتے تو یہ بات سن کر کس قدر خوش ہوتے۔ اب کون ہے اس اندازِ گفتگو کا قدر دان۔‘

زبیدہ : ’’میری رائے میں آپ چائے پیتے جایئے اور باتیں کرتے جایئے۔‘‘

بیوی : ’’نہیں اب میں کل سے یہ کروں گی کہ چائے کا جو وقت ٹالے، اس کی چائے غائب۔ کھانے کے وقت پر سب کو دسترخوان پر ہونا چاہیے۔ واہ اچھا تماشہ ہے کہ کسی بات کا کوئی وقت ہی نہ ہو۔‘‘

قاضی جی : ’’مثلاً...... یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ چائے کا کیا وقت مقرر ہوگا؟‘‘

بیوی : ’’وہی جو مقرر ہے۔ صبح سات بجے۔‘‘

قاضی جی : ’’سات بجے؟ یعنی اس قدر علی الصبح۔ ارے بھئی، سات بجے صبح تو گویا ایک قسم کی آدھی رات ہوتی ہے۔ اس قدر بھی ظلم نہ کرو۔ ٹھہرو میں بتاتا ہوں پروگرام۔ زبیدہ ذرا کاغذ اور قلم لاؤ۔ تمہاری یہی خوشی ہے تو یہی سہی۔‘‘

زبیدہ : اب ناشتہ کر کے بنا لیجیے گا پروگرام۔‘‘

قاضی جی : ’’ٹھہریئے صاحب، ناشتہ تو ہوا ہی کرتا ہے مگر واقعی یہ نہایت مہمل بات ہے کہ ہم لوگوں کے کسی کام کا کوئی وقت ہی مقرر نہیں ہے۔ اسی کی وجہ سے یہ تمام تباہیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ وقت کی قدر کرنا جانتے ہی نہیں ہم لوگ۔ سونے کے وقت جاگتے، جاگنے کے وقت سوتے ہیں۔ ہاں ٹھیک ہے لاؤ یہ کاغذ۔ اچھا تو گویا صبح سے لے کر رات تک کا پروگرام بن جائے چلیے چھٹی ہوئی۔ اس نقشے میں ہونا چاہئیں دو خانے یعنی وقت کا ایک خانہ اور دوسرا خانہ کام کا۔ اے یہ لیجیے۔ نو بجے صبح۔ بیداری۔‘‘

بیوی : ’’لو اور سنو، نو بجے سو کر اٹھا جائے گا۔‘‘

قاضی جی : ’’صاحب، اس سے پہلے اٹھنے کی میرے نزدیک تو کوئی ضرورت ہے نہیں۔ اب یہ دیکھئے کہ اس وقت ساڑھے نو بجے ہیں، مگر آنکھوں میں نیند اس قدر موجود ہے کہ جتنا سویا ہوں، ابھی اتنا ہی اور سو سکتا ہوں۔ دوسرے جاڑے میں تو یہ نو کمبخت بجتے ہیں تقریباً رات کو چار بجے۔ بہر حال، بیداری نو بجے۔ نو بجے سے دس بجے تک ضروریات سے فراغت۔ دس بجے سے ساڑھے دس بجے تک ناشتہ۔ ساڑھے دس

سے گیارہ بجے تک، حقہ نوشی اور اخبار بینی۔ ساڑھے گیارہ بجے تک خطوط کے جواب لکھنا۔ بارہ بجے کھانا۔ ساڑھے بارہ بجے سے ایک بجے تک، حقہ اور پان وغیرہ اور دلچسپ گفتگو۔ ایک بجے سے چار بجے تک قیلولہ۔

زبیدہ : ”مطلب یہ کہ بس کھانا، پینا، سورہنا۔ نہ نماز، نہ کوئی ملکی، قومی کام۔ نہ دنیا کا کوئی اور دھندا۔“

قاضی جی : ”نماز تو اقعی رہ گئی تھی۔ رہ گئے یہ ملکی، قومی کام، وہ تو میرے متعلق ہیں۔“

بیوی : ”خیر، میں یہ شیخ چلیوں کی سی باتیں تو جانتی نہیں۔ کل سے تمہیں وقت پر اٹھنا پڑے گا اور اب میرے گھر میں ہر کام اپنے وقت پر ہوگا یہ اندھی نگری چوپٹ راج مجھے پسند نہیں۔“

قاضی جی : ”تو مجھے کب پسند ہے۔ کل سے اگر میں صبح نو بجے نہ اٹھوں تو پانی ڈال دیا کرو میرے منہ، پر اسی طرح کچھ دنوں میں عادت پڑ جائے گی۔ بلکہ آج میں صبح نو بجے کے لیے الارم لگا کر سونے کے لیے لیٹوں گا۔“

زبیدہ : ”نو بجے نہیں صبح چھ بجے تاکہ سات بجے چاء سے چھٹی ہو جائے۔“

قاضی جی : ”بجا ارشاد! اگر اسی طرح چھ بجے آپ اٹھاتی رہیں مجھ کو تو چائے کیا معنی مجھ ہی سے چھٹی ہو جائے گی چند دنوں میں۔ غالباً آپ کو یہ معلوم ہی نہیں کہ سونا صحت کے لیے کتنا ضروری ہے اور اگر نیند پوری نہ ہو تو انسان کی تندرستی کا کیا حال ہوتا ہے۔“

بیوی : ”ذرا صبح اُٹھنے کی عادت ڈال کر دیکھو کہ صحت کیسی ہو جاتی ہے۔ صبح اٹھ کر اگر تھوڑی دیر تازہ ہوا میں گھوم آیا کرو ایک آدھ میل پھر دیکھو۔“

قاضی جی : ”کیا مطلب؟ یعنی صبح چھ بجے! اس وقت تو گھوڑے بھی سو کر نہیں اٹھتے مجھ کو تانگہ کہاں سے مل جائے گا ایک آدھ گھومنے کے لیے۔ اور فرض کر لیجیے کہ مل بھی گئی کوئی سواری تو دیکھنے والے کیا سمجھیں گے کہ یہ احمق اس وقت کہاں مارا مارا پھر رہا ہے۔ جو دیکھے گا وہی کہے گا بیوی نے قاضی جی کو گھر سے نکال دیا ہے۔

زبیدہ : ”ذرا کسی دن نکل کر تو دیکھیے کہ صبح کتنے لوگ چہل قدمی کو نکلتے ہیں۔“

قاضی جی : اجی مجھے معلوم ہے یہ سب وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے تعلقات گھر والوں سے بڑے کشیدہ ہوتے ہیں اور اگر یہ بات نہیں تو بے چارے ریلوے وغیرہ میں نوکر ہوتے ہیں مگر مجھ سے آپ یہ امید ہرگز نہ رکھئے گا کہ میں کچی نیند میں بستر چھوڑ سڑک پر اونگھنے پہنچ جاؤں گا۔ اکثر کتابوں میں پڑھا ہے کہ صبح کو جب سورج نکلتا ہے تو بڑا خوش گوار منظر ہوتا ہے۔ ہمیشہ ارادہ کیا کہ لاؤ بھئی ہم بھی دیکھ لیں ایک مرتبہ۔ مگر سورج نکلتا کچھ ایسے نامناسب وقت ہے کہ آج تک یہ منظر دیکھنے کا اتفاق نہ ہو سکا۔“

بیوی : ”بھلا بتاؤ یہ تو حال ہے ان کا۔ ان سے کیا امید ہو سکتی ہے کہ یہ وقت کی پابندی کر سکیں گے۔“

زبیدہ : ”وجہ یہ ہے بھائی جان کہ آپ نے اپنے وقت کی تقسیم ہی کچھ بے تکی کر رکھی ہے۔ رات کو اگر آپ اتنی دیر سے نہ سوئیں تو صبح جلد اٹھ سکتے ہیں۔“

قاضی جی : ”آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں سر شام سو جایا کروں بچوں کی طرح۔

وہی مثل کہ چراغ میں بتی پڑی اور بنو پلنگ چڑھی۔ میں اس قسم کی نامعقول بنو ہرگز نہیں ہوسکتا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس دادا کا پوتا ہوں جن کا دربار ہمیشہ رات کو گرم ہوتا تھا۔ نو بجے رات سے احباب نے آنا شروع کیا اور تین چار بجے تک محفل گرم رہی۔ دو ڈھائی بجے دسترخوان بچھا کرتا تھا پھر دن کو ایک سناٹا رہتا تھا۔ کیا مجال کہ پرندہ پر مار جائے۔ ایک دو بجے دن کو بیدار ہوتے تھے مرحوم ومغفور۔‘‘

بیوی : ’’جیسے بڑی تعریف کی بات تھی یہ اور فخر اس طرح کرتے ہیں جیسے لوگ بزرگوں کی عبادت گذاریوں پر فخر کرتے ہیں۔‘‘

زبیدہ : ’’میں تو یہ کہتی ہوں کہ وقت کی پابندی کے ساتھ اگر تفریح بھی ہو جائے تو وہ بھی مفید ہی ہوتی ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’تو کیا وہ لوگ وقت کی پابندی نہیں کرتے تھے؟ یعنی ان کا وقت بندھا ہوا تھا کہ رات کو تین بجے سونا، دن کو ایک بجے اٹھنا۔ مگر میں تو یہ کہتا ہوں کہ یوں تو سب آزادی آزادی کا ڈھونگ رچایا کرتے ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ انسان منٹوں اور سیکنڈوں کا غلام بن کر رہ جائے۔ ارے صاحب ہونا تو یہ چاہیے کہ اپنی نیند ہے جب آئی سو گئے۔ جب آنکھ کھلی اٹھ بیٹھے۔ اپنا پیٹ ہے جب جی چاہا کھا لیا جب جی چاہا پی لیا۔ ان امور میں گھڑی سے مشورہ لینے کی آخر کیا ضرورت ہے۔‘‘

بیوی : ’’ان بے اصولیوں اور بے پروائیوں اور بے ڈھنگے پن کا وقت گذر گیا۔ اب ہم کو ایک ذمہ دار قوم کی حیثیت حاصل ہے اور ہم کو اسی طرح اپنی زندگی کو باقاعدہ بنانا ہے جس طرح ذمہ دار قوم کے لوگوں کی زندگی باقاعدہ ہوتی ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’قوم ...... یعنی قوم سے کیا مطلب؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ قوم کے معاملہ میں آج ہم نے کسی سے خم نہیں کھایا۔ قضیا نہ اپنی قوم کے معاملہ میں ہمیشہ سے کھرا ہے۔ اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہم گویا آپ کی توجہ سے پہلے کچھ بدقوے تھے تو یہ محض آپ کا خیال ہے اور خیال بھی وہ جو بالکل خام ہے۔ قوم کا ہمارے یہاں اتنا خیال رکھا گیا کہ دادا جان کسی ایسے شخص سے شطرنج تک نہ کھیلتے تھے جو حسب نسب سے درست نہ ہو۔ سیکڑوں لڑکیاں کنواری مر گئیں مگر مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہ لگا۔ اب اللہ کی شان کہ آپ ہماری قوم کو باقاعدہ بنانے چلی ہیں۔‘‘

زبیدہ : ’’بھائی جان بات تو سمجھا کیجیے۔ ان کا مطلب ہے ملت سے۔ حصول پاکستان کے بعد دنیا کی تمام قوموں کی ہم پر نظر ہے۔ ہم ایک امتحانی دور سے گذر رہے ہیں۔ پرکھنے والے ہم کو پرکھ رہے ہیں۔

قاضی جی : ’’دنیا کی تمام قوموں کی نظر تم پر ہوسکتی ہے۔ آنکھ پھوڑ دوں بخدا اگر کوئی نظر اٹھا کر بھی تم کو دیکھے۔ کیا سمجھا ہے آخر تم نے مجھ کو۔‘‘

بیوی : ’’نہ سمجھو نہ بوجھو اپنے مطلب کی بات نکالی اور لگے بکنے۔ بات تو سمجھا کرو۔ وہ یہ کہہ رہی ہیں کہ پاکستان ملنے کے بعد......‘‘

قاضی جی : ’’پاکستان۔ پاکستان۔ پاکستان۔ میں آپ لوگوں کی زبان سے پاکستان سن کر چپ نہیں ہوسکتا۔ پاکستان ہو یا انگلستان یہ میں کچھ نہیں جانتا مگر دنیا کی نظر کیسے پڑسکتی ہے تم پر۔ اپنی جان اور دنیا کی جان ایک کردوں۔ مذاق نہ باشد۔‘‘

زبیدہ : ’’توبہ ہے بھائی جان۔ ذکر تھا کچھ سمجھے آپ کچھ۔ مطلب صرف یہ ہے کہ اب ہم پاکستانی ہیں اور ہم کو اپنی زندگی کے ہر گوشے میں ایک باقاعدگی پیدا کرنا ہے۔‘‘

بیوی : ’’ان کی سمجھ میں کبھی جو کچھ آئے۔ جتنا جتنا سمجھاؤ گی وہ الجھتے جائیں گے۔‘‘

قاضی جی : ’’اجی تو مجھ ناسمجھ نامعقول نانہجار کو آپ آخر سمجھاتی ہی کیوں ہیں؟ اچھی خاصی باتیں ہو رہی تھیں کہ پاکستان کا قصہ لے بیٹھیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ آخر پاکستان کا یہاں ذکر ہی کون سا تھا؟ سوال تھا چائے کے ٹھنڈے ہونے کا اور میں یہ کہہ رہا تھا کہ چائے پر نیند بہرحال قربان نہیں ہو سکتی۔ تو صاحب وہاں چھیڑ دیا گیا پاکستان کا قصہ تاکہ مجھ بدنصیب کو یہ چائے بھی میسر نہ آئے میں خون پانی ایک کر کے رہ جاؤں۔ نیند کی نیند غارت کی، چائے الگ دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی۔ اب سب کے کلیجہ میں ٹھنڈک پڑ گئی ہو گی۔ ہٹاؤ یہ چائے یہاں سے۔ باز آیا میں اس چائے سے کبھی جواب پیوں۔‘‘

(۲۱)

(قاضی جی گھبرائے ہوئے آتے ہیں)

قاضی جی : ’’زبیدہ۔ ارے بھئی زبیدہ۔ کیا تم ابھی میرے کمرے کے سامنے سے بال کھولے ہوئے گذری تھیں؟‘‘

زبیدہ : ’’کون میں؟ میں تو یہاں سے اُٹھی بھی نہیں۔‘‘

قاضی جی : ’’تو پھر جلدی سے کوئی دعا وغیرہ پڑھ کر مجھ پر دم کرو۔ میں کہتا ہوں ضرور اس گھر میں آسیبی خلل ہے۔ جس دن سے تمہاری بھابی جان میکے گئی ہیں۔ مجھ کو برابر کچھ نہ کچھ نظر آ رہا ہے۔ خدا کے لیے سب بتیاں کھول دو۔ اور ذرا جمیل میاں کو آواز دے کر بلا لو۔ ارے بھئی جاؤ نہیں مجھ کو اکیلا چھوڑ کر، یہیں سے آواز دے دو۔ جل تو جلال تو صاحبِ کمال تو، آئی بلا کو ٹال تو۔‘‘

زبیدہ : ’’کیا باتیں ہیں آپ کو بھی بھائی جان۔ خود اپنی پرچھائیں دیکھ لی ہو گی۔ ایسا بھی کیا ڈر۔‘‘

قاضی جی : ’’بھئی خدا کے لیے اس وقت بحث نہ کرو۔ میرا دل ہاتھوں اچھل رہا ہے۔ تمہاری بہادری کسی دن میری جان لے کر رہے گی۔ خدا کے لیے تم جمیل میاں کو بلا دو۔ یہیں سے پکار لو ساجدہ کو۔ تم یہاں سے جاؤ نہیں۔ تم ذرا میرے قریب ہی رہو اس وقت۔‘‘

زبیدہ : ’’(آواز دیتے ہوئے) ساجدہ بہن۔ میں نے کہا ساجدہ بہن۔‘‘

(ساجدہ کی آواز) کیا ہے زبیدہ آپا؟‘‘

زبیدہ : ’’ذرا جمیل بھائی کو جلدی سے بھیج دو۔ بھائی جان کچھ ڈر گئے ہیں۔‘‘

قاضی جی : ’’میں نے ہمیشہ یہی کہا کہ یہ گھر ٹھیک نہیں ہے۔ تین موتیں ہو چکی ہیں اس گھر میں، اس گھر کو بدل دیا جائے۔ مگر میری سنتا کون ہے۔ بس کسی دن پھڑ پھڑا کر میرا دم نکل جائے گا۔‘‘

جمیل : (آتے ہوئے)’’خیریت تو ہے۔ آخر بات کیا ہوئی؟‘‘

ساجدہ : (قریب آکر) ہوا کیا آخر؟

قاضی جی : ’’ارے صاحب ہوتا کیا وہی آج پھر ہوا جو اکثر ہوا کرتا ہے۔ ہزار مرتبہ ان لوگوں سے کہا کہ اس گھر پر کسی کا سایہ ہے مگر مجھ کو تو اس گھر میں احمق سمجھا جاتا ہے۔ جس دن سے وہ گئی ہیں ایک تو دل یوں ہی گھبرایا کرتا ہے۔ دوسرے مسلسل کسی نہ کسی کو دیکھتا ہوں۔ ابھی میں کمرے میں بیٹھا ان کو خط لکھنے کے لیے مختلف اشعار سلیٹ پر نوٹ کر رہا تھا کہ ایک دم دروازے کے سامنے ایک عورت سر کے بال کھولے ادھر سے ادھر گذر گئی۔‘‘

جمیل : ’’(ہنس کر) لاحول ولا قوۃ! مسلمان ہو کر آپ ایسی باتیں کہتے ہیں قاضی جی۔ کچھ نہیں وہم ہوگا آپ کا۔‘‘

قاضی جی : ’’وہم کیسا صاحب یعنی میں نے بچشم خود دیکھا ہے سفید لباس تھا ان مسماۃ کا۔ آپ کو معلوم نہیں اس مکان میں جو صاحب پہلے رہتے تھے، ان کی دو بیویاں تھیں۔ چنانچہ ایک بیوی یہ کہہ کر مری تھیں کہ خیر جل جل کر مر تو رہی ہوں مگر مرنے کے بعد بھی پیچھا نہ چھوڑوں گی۔ چنانچہ

وہ اب تک اسی مکان میں موجود ہیں۔ اب کون ان سے کہے کہ قصور اگر تھا تو آپ کے شوہر کا یا آپ کی موت کا تھا۔ آخر ہم بے گناہوں کو آپ کیوں گھیرے ہوئے ہیں۔‘‘

ساجدہ : ’’بھئی اللہ میرا بھی دل دھڑکنے لگا۔‘‘

جمیل : ’’تم تو اور بھی بیوقوف۔ ہوا اس میں دل دھڑکنے کی کیا بات ہے۔‘‘

قاضی جی : ’’کیا مطلب؟ گویا میں تو مسلم الثبوت بے وقوف ہوں ہی یہ اور بھی بیوقوف ہیں۔ بندہ نواز میں آپ لوگوں کے اس ڈھکوسلے کا قیامت تک قائل نہیں ہو سکتا کہ بھوت چڑیل وغیرہ کچھ ہوتے ہی نہیں ہیں۔ نہیں ہوتے تو پھر یہ مسماۃ کون تھیں جو تشریف لائی تھیں اپنے گیسو بکھرائے ہوئے؟ آپ کہتے ہیں اس میں دل دھڑکنے کی کیا بات ہے۔ ملاقات ہو جائے ایک مرتبہ تو پتہ چلے۔ یہ ساری شیخی دھری رہ جائے۔‘‘

زبیدہ : ’’توبہ۔ توبہ بھائی جان یہ کیسی ایمانی کمزوری ہے کہ آپ مسلمان ہو کر اپنے وہم سے ڈر رہے ہیں۔‘‘

قاضی جی : ’’صاحب یہ ایمانی کمزوری ہو یا شہ زوری مگر آپ فوراً اپنی بھابی جان کو تار دیجیے کہ اگر سہاگ پیارا ہے تو فوراً واپس آجاؤ۔ ان کی موجودگی میں ایسا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا۔ صرف ایک مرتبہ والد صاحب نظر آئے تھے۔‘‘

ساجدہ : ’’سچ مچ کیا وہ بھی نظر آئے تھے؟‘‘

قاضی جی : ’’وہ تو نظر کیا آئے تھے یہ کہیے کہ خدا نے مجھ کو بچا ہی لیا ورنہ لے گئے ہوتے اپنے ساتھ۔ میں اسی کمرے سے نکل رہا تھا کہ دیکھتا کیا ہوں

آپ کھڑے ہوئے ہیں کھیسیں نکالے۔ میرے منہ سے نکل گیا ابا تو کہنے لگے ہاں بیٹا۔ اے صاحب میں بھاگا سر پر پیر رکھ کر۔ بات یہ ہے کہ بھوت خواہ اپنا باپ ہی کیوں نہ ہو آخر بھوت ہے۔“

زبیدہ : ”اللہ نہ کرے میرے ابا جان بھوت بن کر آئیں۔ آپ کو بُرا بھی نہیں لگتا کہتے ہوئے۔“

قاضی جی : ”جی بجا ارشاد یعنی اس میں بھی گویا میرا قصور ہے۔ صاحب جہاں تک باپ ہونے کا تعلق ہے تمام دنیا جانتی ہے کہ میں نے ہمیشہ کیسی سعادت مندی اور فرمانبرداری کا سلوک کیا ہے ان کے ساتھ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مارے شفقت کے مرنے کے بعد بھی تشریف لایا کریں میرا دم نکالنے کو۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے، یہ بات تو خود ان کو سوچنا تھی کہ مرنے کے بعد اس طرح آنا ان کو زیب دیتا تھا۔ یقین جاننا اجمل میاں مہینہ بھر تک مجھ کو بخار آیا ہے۔“

جمیل : ”قاجی جی قصہ اصل میں یہ ہے کہ آپ دل کے بہت کمزور ہیں۔ ورنہ یہ بھوت ددت تو کوئی چیز ہی نہیں ہوتے۔“

قاضی جی : ”صاحب ان ہی باتوں سے میرے آگ لگ جاتی ہے۔ خدا بخشے آپ کی بھابی کو، مگر نہیں خدا ان کو خدانخواستہ کیوں بخشے، وہ تو میکے گئی ہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ آپ کی بھابی صاحبہ بھی ان باتوں کو نہایت مہمل سمجھتی ہیں۔ وہ بھی مارے فیشن کے فرماتی ہیں کہ یہ بھوت اور آسیب وغیرہ گویا کچھ ہوتے ہی نہیں۔“

زبیدہ : ”فیشن کی بات نہیں بھائی جان کوئی مسلمان ان وہموں پر ایمان نہیں لاسکتا۔“

قاضی جی : ”کمال ہے صاحب یعنی حال یہ ہے کہ بیٹھے ہوئے ہیں کمرے میں، عطر کا کہیں نام ونشان نہیں، کپڑے بھی میں عموماً میلے ہی پہنے رہتا ہوں، جن میں عطر کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ کہ یکا یک سارا کمرہ مہک اٹھا۔ کبھی خس کا عطر، کبھی شمامۃ العنبر، کبھی رات کی رانی۔“

ساجدہ : ”بھئی اللہ۔ اب آج رات کو نیند بھی نہ آئے گی مجھے۔“

جمیل : ”تم جب ایسی باتیں کرتی ہو مجھے اور بھی غصہ آتا ہے۔“

قاضی جی : ”جی نہیں آپ کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ بیچاری بھی آپ لوگوں کی طرح سینہ میں پتھر کا دل رکھ لے۔ اے جناب وہ بیچاری تو عورت ہے۔ مجھ مرد کا یہ حال ہے اب تک ہاتھ پیر ٹھنڈے ہیں اور خود میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ آج میں تنہا یہاں لیٹوں۔ آپ لوگوں کے بستر بھی یہاں آئیں گے ورنہ میں تو سہم سہم کر ختم ہو جاؤں گا رات بھر میں۔ صبح ہو جائے کسی طرح تو یہ سمجھئے کہ پھر سے پیدا ہوئے۔ کل ہی دوسرا مکان لیتا ہوں۔ بھوتوں کے اس ڈیرے میں کون رہ سکتا ہے۔“

اجمل : ”قاضی جی یوں آپ شوق سے مکان بدل لیں۔ لیکن اتنا اچھا مکان محض ایک وہم کی وجہ سے چھوڑ دینا میری سمجھ میں تو آتا نہیں۔ اچھا اگر آپ واقعی اس مکان کو چھوڑنا طے کر چکے ہیں تو میرے مکان سے بدل لیجیے۔ میں اس طرف اٹھ آؤں آپ میری طرف چلے جایئے۔“

ساجدہ : ”واہ قیامت تک تو میں اس مکان میں رہ نہیں سکتی۔ میں تو ایک ہی دن میں مر کے رہ جاؤں گی۔“

قاضی جی : ”یعنی کیا مطلب؟ گویا مر کے آپ کا بھی رہ جانے کا ارادہ ہے اسی میں۔ صاحب یہ عجیب بات ہے اس مکان میں کہ جو مرا اس میں اس

کی روح یہیں رہ جاتی ہے۔ جنازہ اٹھ جاتا ہے۔ بہرحال میں اس کے لیے تیار ہوں۔''

''اگر آپ آنا چاہیں اس حصہ میں تو میں آپ کے مکان میں مزے سے بسر کرلوں گا۔''

زبیدہ : ''بھائی جان میں پھر کہتی ہوں کہ یہ خواہ مخواہ کا ڈر ہے۔ آپ ایک ناممکن بات کے قائل ہو کر رہ گئے ہیں۔''

قاضی جی : ''استغفراللہ۔ اب آخر میں آپ لوگوں کو کس طرح سمجھاؤں کہ یہ ناممکن باتیں نہیں ہیں۔ تم کو وہ یاد ہے کریمن کی ماں۔ توبہ۔ توبہ۔ اس قدر مکروہ صورت تھی وہ کمبخت اور ایسی گھناؤنی کہ میں کیا عرض کروں اور صاحب ان مسماۃ پر کوئی صاحب آیا کرتے تھے۔ ایسا ایسا کھیلتی تھی وہ مردار کہ میں کیا کہوں۔ مرچوں کی دھونی اس کو دی جاتی تھی۔ جوتے کاری الگ ہوتی تھی اور بمشکل تمام وہ صاحب بیان کرتے تھے کہ میں نتھو چمار ہوں اور اس وقت تک اس کے سر سے نہ اتروں گا، جب تک آدھ سیر گلاب جامنیں نہ کھلائی جائیں گی۔ نتیجہ یہ کہ گلاب جامنیں جب کریمن کی ماں کے منہ کے معرفت وہ ہضم کر لیتے تھے اتر جایا کرتے تھے اور پھر کچھ دن کے بعد موجود۔''

زبیدہ : بنی ہوئی تھی وہ کمبخت۔ مٹھائی کھانے کے لیے بہانے کرتی تھی۔''

قاضی جی : ''خیر۔ خیر یہ ناممکن ہے یعنی آدھ سیر مٹھائی کے لیے سیر سیر بھر کے خدا جانے کتنے تو جوتے کھا جاتی تھی۔ مرچوں کی دھونی الگ سے اور مولوی عبدالصمد صاحب اس بُری طرح اس کے جھونٹے پکڑتے تھے کہ اگر سر پر نتھو چمار کا بھوت نہ ہوتا تو چوٹی اکھڑ کے ہاتھ میں آجاتی۔ مطلب کہنے کا یہ کہ اگر یہ بھوت پریت کچھ ہوتے ہی نہیں ایک سرے سے تو یہ جوان کے واقعات مشہور ہیں یہ گویا سب ایک سرے سے جھوٹ ہیں۔ کم سے کم میں یہ نہیں مان سکتا۔''

جمیل : ''قاضی جی یہ سب غیر اسلامی توہم پرستی ہے۔ یہ من گھڑت افسانے سب عہد جہالت کی یادگار ہیں۔ اسلام نے ان تمام وہموں کو ختم کر دیا۔ مذہب کے علاوہ سائنس کے نقطۂ نظر سے بھی ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں۔''

قاضی جی : ''بندہ نواز اگر حقیقت نہیں ہے تو۔ تو۔ (کچھ سونگھ کر) یہ کیا۔ آئی کچھ آپ کی ناک میں خوشبو۔ بھئی خدا کے لیے اپنی طرف چلو۔ جس گھر میں اس قسم کا اثر ہو وہاں یہ تذکرے بھی نقصان پہونچا دیتے ہیں۔ یعنی اس قدر خوشبو آرہی ہے عطر کی گویا میں خود لگائے بیٹھا ہوں عطر۔''

جمیل : ''حد کردی قاضی جی آپ نے۔ میں نے ابھی جیب سے رومال نکالا ہے۔ اتفاق سے اس میں عطر لگا ہوا ہے۔ دیکھیے یہی خوشبو ہے نا۔''

قاضی جی : ''صاحب مجھے تو عطر کی خوشبو سے ایک قسم کی وحشت ہونے لگی ہے۔ یعنی عطر کی خوشبو آئی اور میری روح نے پرواز کے لیے پر تولنا شروع کیے۔ آپ یقین جانئے میری صحت پر نہایت بُرا اثر پڑ رہا ہے اس ہر وقت کے سہنے کا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس گھر میں خلل ہے ضرور۔ چھٹن خاں اس روز کہہ رہے تھے کہ اس لڑائی دنگے میں اتنے خون ہوئے ہیں کہ بھوتوں کی تعداد بے انتہا بڑھ گئی ہے۔''

ساجدہ : ''اوئی۔ یہ کون۔ یہ۔ یہ۔''

قاضی جی : ''ارے کون۔ یہ۔ یہ۔ یہ۔ ای۔ ای۔ ای۔''

زبیدہ : ''واہ واہ گلشن ہے۔ نہانے گئی تھی غسل خانے میں۔ ارے ہاں یہی گذری ہوگی آپ کے کمرے کے سامنے سے بال کھولے ہوئے۔''

جمیل : 'سبحان اللہ۔ ایک سے ایک بہادر موجود ہے یہاں۔''

قاضی جی : ''کسی دن ان بوگلشن کا یہ غسل جان لے لے گا میری۔ کوئی پوچھے کہ یہ رات کے وقت ایسے بیہودہ بال کھول کر آپ کو نہانے کی کیا سوجھی تھی۔ پھر یہ کہ جناب روز روشن میں بھتنی نظر آتی ہیں، رات کو تو کوئی شک ہی نہیں رہتا۔ خبردار جو آئندہ سے یہ بیہودگی کی۔ کیا کسی کی جان لینے کا ارادہ ہے۔ دور ہو میرے سامنے سے۔''

ساجدہ : ''میرا تو دم ہی نکل گیا تھا دیکھ کر۔ بھئی خدا کے لیے اب یہ ذکر ختم کیجیے۔''

جمیل : ''تمہارا علاج تو یہ ہے کہ واقعی کسی بھوت یا چڑیل سے سامنا کرا دیا جائے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ یہ چیزیں ہوتی ہی نہیں ہیں۔''

قاضی جی : ''پھر وہی۔ ہوتی کیسے نہیں ہیں۔ میں آپ سے عرض کروں چھٹن خاں کے خُسر نے ایک شادی کر لی تھی کہیں آسام وغیرہ میں۔ اب جناب دلہن جو بیاہ لائے تو چندے آفتاب چندے مہتاب۔ بال بال موتی پروئے، دیکھ کر بہت خوش ہوئے مگر پیروں پر جو نظر پڑی تو ایڑی آگے پنجہ پیچھے۔ بھاگنے کا جو ارادہ کیا تو وہ ناک میں ہنسی ہنہہ ہنہہ ہنہہ اب جناب آگے آگے دولہا سرپٹ پیچھے پیچھے دلہن دُلکی۔ بھاگتے بھاگتے یہ حضرت ایک مسجد میں گھس گئے تو یہ کہیے کہ جان بچ گئی۔ ورنہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دلہن روزانہ ایک دولہا کا ناشتہ کرتی تھی۔''

جمیل : ''آپ بھی کن جاہلوں کی باتوں میں آجاتے ہیں قاضی جی۔ لاحول ولاقوۃ۔''

قاضی جی : ''لاحول ولاقوۃ کیا معنی صاحب۔ میں نے تو یہ واقعہ سن کر گھر آتے ہی آپ کی بھابی جان کے پیر نہایت غور سے دیکھے کہ ایڑی کدھر ہے۔ اور پنجہ کدھر ہے ان امور میں احتیاط اچھی ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ خدا بچائے ناپاک روحوں سے نہایت ظالم ہوتی ہیں۔ میری اگر روح فنا ہوتی ہے کسی چیز سے تو وہ یہ ناپاک روحیں ہیں۔''

زبیدہ : ''خیر اب وہ ناپاک روحیں پاکستان......''

قاضی جی : ''پاکستان لیجیے صاحب اس ذکر میں بھی پاکستان۔ صاحب تشریف لے آئے۔ میری تو عقل حیران ہے کہ آخر یہ ہر بات میں پاکستان کیسے یاد آجاتا ہے۔ ذکر تھا بھوتوں کا، شکایت کر رہا تھا میں اس مکان کی۔ وہ لے آئیں پاکستان کا ذکر۔''

جمیل : ''جی ہاں ان کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے پاکستان میں اب انشاءاللہ یہ توہم پرستی نہ ہو سکے گی۔ ان غیر اسلامی باتوں کی اب یہاں کھپت نہیں ہو سکتی۔''

قاضی جی : ''صاحب کھپت ہو یا نہ ہو مگر اس گھر میں خلل ضرور ہے۔ مجھ کو یا تو اپنے یہاں لے چلیے یا خود یہاں قیام کیجیے۔ میرے لیے تنہا اس گھر میں رہنا ناممکن ہے (آواز دے کر) گلشن۔ میرا بستر جمیل میاں کے ہاں پہنچا دو فوراً۔''

(۲۲)

(باہر پوسٹ مین آواز دیتا ہے)

پوسٹ مین : ''خط لے جائیے ...... پوسٹ مین۔''

قاضی جی : ''ارے بھئی کوئی سن رہا ہے۔ ڈاک لے لونا۔ زبیدہ۔ پوسٹ مین۔ ڈاکیہ۔ ارے بھئی خط۔''

زبیدہ : ''لے آئی بھائی جان لے آئی خط۔ آج تو دو تین خط ایک دم آ گئے۔''

قاضی جی : ''آ گیا ہوگا تمہاری بھابی جان کو میرا خیال، بس ڈال دیئے لکھ لکھ کر دو تین خط تلے اوپر۔ میں نے بھی تو پچھلے خط میں ایسے پھڑکتے ہوئے اشعار لکھے تھے کہ تڑپ کر رہ گئی ہوں گی میکے میں۔ اوں۔ یہ۔ یہ کون ہیں بھئی۔''

زبیدہ : ''میری سہیلی ہیں نسیم، مجھ سے ملنے آئی ہیں۔''

نسیم : ''میں تو بڑی دیر سے سلام کر رہی ہوں۔ آپ نے دیکھا ہی نہیں۔''

قاضی جی : ''بہر حال۔ بہر حال۔ وعلیکم السلام۔ ارے بھئی زبیدہ ذرا مجھ کو چشمہ تو دو خدا جانے کیا لکھا ہے تمہاری بھابی نے۔ معلوم ہوتا ہے بیگم صاحبہ گھبرا گئی ہیں۔ ایک ہی دن میں متعدد خط ڈل دیئے۔ عجیب پاگل عورت ہے صاحب یہ بھی۔ ارے کوئی پوچھے کوئی میں مرا تھوڑا ہی جا رہا ہوں۔ جو اس طرح ڈاک بٹھا رکھی ہے۔''

زبیدہ : ''یہ لیجیے چشمہ۔''

قاضی جی : ''ہاں تم بھی سن لو اپنی بھابی جان کا نامۂ شوق۔ فرماتی ہیں: جناب بھائی صاحب قبلہ۔ آداب۔''

زبیدہ : ''(ہنس کر) بھائی صاحب قبلہ۔''

قاضی جی : ''یہ کیا بیہودگی ہے یعنی بھائی صاحب قبلہ سے کیا مطلب۔ شوہر کو تو کچھ ہمدم و دمسازِ من سلامت یا میرے سرتاج وغیرہ لکھنا چاہیے۔ یہ آخر حرکت کیا ہے ان بیگم صاحبہ کی۔ میکے جا کر دماغ ہی خراب ہو گیا۔''

زبیدہ : ''کسی اور کا خط ہوگا بھائی جان۔ ذرا نام پڑھیے لکھنے والے کا۔''

قاضی جی : ''ایں؟ ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ یہ تو شکیلہ کا خط ہے۔ استغفراللہ۔ بھئی واقعی استغفراللہ۔''

نسیم : ''تو کیا آپ بھابی کی تحریر بھی نہیں پہچانتے۔''

قاضی جی : ''پہچانتا کیوں نہیں ہوں مگر عورتوں کے خط قریب قریب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وہی کبوتر کی چونچ نما جیم وہی پتیلی کے ایسے دائرے وہی دستی چھڑی کی سی میم۔ سطریں ٹیڑھی نقطے الگ الگ۔ تو خیر یہ ہوگا۔ دوسرا خط اوں؟ ہاں غالباً یہی ہے ٹھیک ہے یہی ہے۔ سنو بھئی فرماتی ہیں: میرے سرتاج خدا آپ کو سلامت رکھے۔ ابھی آپ کا سولھواں خط ملا۔ مگر اس خط میں بھی اشعار ہی اشعار تھے۔ آپ نے یہ کچھ نہ لکھا کہ دھوبی کے یہاں جو تکیے کے غلاف رہ گئے تھے، وہ آپ نے منگائے یا نہیں (لاحول ولاقوۃ) اور نہ یہ لکھا کہ دودھ والے کا حساب کر دیا ہے یا نہیں (شہ) اور ہاں زبیدہ بہن سے یہ ضرور پوچھ کر

لکھئے گا کہ قومی بچت کے پندرواڑے میں انھوں نے کچھ زیور بیچ کر سرٹیفکیٹ لیے یا نہیں۔ یعنی کیا مطلب گویا اب زیور بھی بکنا شروع ہوں گے۔ یہ آخر قصہ کیا ہے؟"

زبیدہ : "اتفاق سے میں اس وقت نسیم بہن سے یہی باتیں کر رہی تھی۔ بات یہ ہے بھائی جان کہ ۸/اپریل سے ۲۲/اپریل تک قومی بچت کے دو ہفتے منائے جا رہے ہیں تاکہ ہم لوگ اپنے بچائے ہوئے روپے کے پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ خرید سکیں۔ یہ دیکھئے نسیم بہن تو اپنے تمام زیور بیچ کر یہ سرٹیفکیٹ خرید چکی ہیں۔"

قاضی جی : "سبحان اللہ تو یہ گویا قومی بچت ہے۔ اچھی خاصی قومی چپت ہے۔ آپ کہتی ہیں قومی بچت ہے۔ آج تک ہمارے گھرانے میں عورتوں کے زیور بیچ کر کوئی چیز نہیں خریدی گئی مگر اب وہ زمانہ آ گیا ہے کہ عوتیں خود اپنے زیور بیچ بیچ کر اپنی من مانی کرتی پھرتی ہیں۔ کیوں صاحب میں آپ کی ان سہیلی صاحبہ سے دریافت کر سکتا ہوں کہ زیور بیچ کر جو یہ کاغذ کے پرزے خریدے گئے کیا ان پر شہد لگا کر چاٹا جائے گا۔"

نسیم : "شہد لگا کر چاٹنے کی بات نہیں قاضی جی۔ بلکہ اس طرح میں نے اس سرمایہ کو جو زیوروں کی صورت میں بیکار پڑا ہوا تھا ہر خطرے سے محفوظ بھی کر دیا اور ایک مفید کام میں بھی لگا دیا۔

قاضی جی : "اور خود ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ ماشاء اللہ۔ اے جناب کفایت شعاری کو میں خود برا نہیں کہتا۔ بلکہ میرا تو ارادہ یہ تھا کہ اس مرتبہ ایسا انتظام کروں گھر کا کہ بیگم صاحبہ آ کر دنگ رہ جائیں کہ اخراجات آخر

اتنے کیوں کر گھٹ گئے ایک دم سے۔ قومی بچت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ مثلاً میں نے گنڈے دار کھانے کا انتظام رکھا ہے اپنی اسکیم میں۔ نہیں سمجھیں؟ گنڈے دار سے مطلب یہ ہے کہ ایک دن کھانا دوسرے دن روزہ۔ پھر تیسرے دن کھانا چوتھے دن روزہ۔ شروع شروع میں کچھ تکلیف ضرور ہوگی۔ مگر رفتہ رفتہ اسی کی عادت ہو جائے گی۔"

زبیدہ : "بھائی جان قومی بچت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ پیٹ کاٹنا شروع کر دیں۔"

قاضی جی : "نہ میں پیٹ کاٹنا شروع کرنا چاہتا ہوں نہ جیب کاٹنا شروع کرنا چاہتا ہوں۔ میرا مطلب تو ہے بچت سے۔ ایک ترکیب اور بھی ذہن میں آتی تھی کہ مثلاً دن کے وقت پک گئی صرف روٹی گویا سالن غائب۔ رات کو پک گیا سالن اور روٹی غائب۔ اس طرح باورچی خانہ کی رونق اور چہل پہل میں بھی کوئی فرق واقع نہ ہوا اور اخراجات بھی نصف رہ گئے۔ جی؟"

نسیم : "یہ باتیں آپ سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں یا مذاق بھی آپ اس سنجیدگی سے کیا کرتے ہیں؟"

قاضی جی : "جی؟ مذاق۔ کیا مطلب مذاق سے گویا اب میں چھوٹی بہن یا چھوٹی بہن کی سہیلی جو ایک قسم کی گویا چھوٹی بہن ہوتی ہے اس سے مذاق کروں گا۔ صاحب آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں جہاں اس بات کا قایل نہیں ہوں کہ بات بات میں گویا عادتاً بلکہ گویا تکیہ کلام کے طور پر پاکستان کا وظیفہ پڑھا جائے اسی طرح میں پاکستان کی اہم

ضروریات کا بھی بیحد خیال رکھتا ہوں مثلاً اب میرے نزدیک قومی بچت بے حد ضروری چیز ہے مطلب یہ کہ ضرور ہونا چاہیے قومی بچت۔“

زبیدہ : ”مگر بھائی جان قومی بچت اس طرح تو نہیں ہو سکتی کہ آپ کھانا پینا چھوڑ دیں۔ جس مہم کے لیے یہ دو ہفتے مقرر کیے گئے ہیں وہ کچھ اور ہے۔ اس کا مقصد کسی کو تکلیف پہونچانا نہیں ہے بلکہ محض اس روپیہ کو حرکت میں لانا ہے جو ہماری تجوریوں میں مفلوج پڑا ہوا ہے۔“

قاضی جی : ”مفلوج پڑا ہوا ہے یعنی روپے پر بھی اب فالج گرنے لگا ہے۔ صاحب عجیب عجیب باتیں ہونے لگی ہیں اس زمانے میں۔ آج تک کم سے کم میں نے تو کبھی سنا نہیں تھا کہ روپیہ پیسہ کو بھی کچھ علالتیں لاحق ہو سکتی ہیں۔“

نسیم : ”آپ تو عجیب باتیں کرتے ہیں۔ روپیہ کے مفلوج ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام روپیہ جو زیوروں کی صورت میں، زمینوں کی صورت، میں، یا محض روپیہ کی صورت میں یوں ہی خواہ مخواہ جمع ہے اور کسی کام میں لگا ہوا نہیں ہے وہ مفلوج ہی ہوا نا۔“

قاضی جی : ”لاحول ولا قوۃ۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ لوگ اچھی خاصی باتیں کرتے کرتے شاعری کر سکتی ہیں۔ اور میرا یہ حال ہے کہ میں جن چند بیماریوں سے ڈرتا ہوں ان میں سے ایک فالج بھی ہے۔ صاحب یہ ایسی نامراد بیماری ہے کہ بغیر کسی اطلاع کے اچھا خاصا آدمی ایک طرف کو لڑھک جائے ایک دم سے۔ اور بعد میں پتہ چلے کہ فالج گرا ہے۔ میرے خالو تھے خدا ان کو غریق رحمت کرے۔ ان پر ایک دن گرا فالج اور وہ گرے چارپائی پر، چارپائی گری دھڑام سے زمین پر گویا فالج گرتا ہی چلا گیا۔ اب جو دیکھتے ہیں خالو صاحب کو تو بے ہوش، بڑی دوڑ دھوپ کے بعد پتہ چلا کہ فالج گرا ہے۔ مگر صاحب خدا بھلا کرے کبوتروں کا ان کی یخنی سے وہ بچ گئے۔ مگر نہیں بچے کہاں۔ یہ کہیے کہ کبوتر بچ گئے تھے یخنی بننے سے۔ ان بیچارے کا تو شاید انتقال ہی ہو گیا تھا۔

زبیدہ : ”مگر میرا مطلب تو اس فالج سے یہ تھا بھائی جان کہ یہ جو زیوروں کی صورت میں ہماری دولت بیکار پڑی ہوئی ہے یہ آخر کس کام کی ہے۔“

قاضی جی : ”دیکھیے صاحب میں ہر قسم کی بات برداشت کر سکتا ہوں مگر ایسی بات جس سے خاندان کی عزت پر حرف آئے میں سن بھی نہیں سکتا۔ میرے یہاں اس بات کو نہایت معیوب سمجھا جاتا ہے کہ عورتوں کے زیور رہن رکھے جائیں یا خدا وہ دن دکھائے کہ فروخت کیے جائیں۔ چھوٹے ماموں کا قصہ بھول گئیں کہ ابا جان کو جب یہ خبر ہوئی کہ ان حضرت نے ممانی جان کے زیور رکھ کر الکشن لڑا ہے تو مارے غصہ کے اس تیلی کو ووٹ دے دیا تھا جو ان کے مقابلہ پر کھڑا ہوا تھا اور کہلوا دیا تھا چھوٹے ماموں سے کہ تم سے وہ تیلی ہزار درجہ اچھا جس نے بیوی کا زیور رکھ کر الکشن نہیں لڑا۔“

نسیم : ”یہ دوسری بات ہوئی۔ ہم لوگ اس طرح تو زیور بیچنے نہیں جا رہے ہیں۔ بلکہ ہم تو زیوروں کو گویا ایسی محفوظ جگہ رکھ رہے ہیں کہ نہ

چوری کا اندیشہ نہ اس کا ڈر کہ آج سونے چاندی کا بھاؤ کچھ ہے کل کچھ اور نہ ہو جائے۔ پھر یہ کہ یہ روپیہ برابر بڑھتا رہے گا جوان کی قیمت کا ہے۔''

قاضی جی : ''کسی جادو کے پٹارے میں جناب بند کرآئی ہیں اپنے زیور یا گولر کا پھول پڑ گیا ہے آپ کے زیوروں میں کہ ان کی قیمت خود بخود بڑھتی رہے گی۔ میری تو سمجھ میں جناب کے طلسماتی ارشادات آئے نہیں۔ آپ لوگوں کا تو اب ایک کام یہ رہ گیا ہے کہ چونکا دینے والی باتیں کر کے ہم سادہ لوحوں کو گویا بھونچکا بناتی رہیں۔''

زبیدہ : ''بھائی جان نہ یہ کوئی جادو ہے نہ طلسمات۔ حکومت پاکستان نے پاکستان سیونگ سرٹیفکیٹ جاری کئے ہیں تا کہ اہل پاکستان اپنا وہ روپیہ جو زیوارات کی صورت میں یا زمینوں کی صورت میں یا نقد کی صورت میں بیکار جمع ہے وہ حکومت کو دے کر یہ سرٹیفکیٹ حاصل کر لیں۔ اس روپیہ کو گویا اپنے پاس جمع کرنے کے بجائے حکومت کے پاس جمع کرا دیں۔''

نسیم : ''حکومت اس روپیہ سے قومی تعمیر کی مہم شروع کر سکے گی۔ رہ گیا ہمارا روپیہ وہ اس طرح پاکستان کے استحکام کے کام میں آنے کے علاوہ نہ صرف محفوظ رہے گا بلکہ اس پر حکومت ہم کو یہ ا۔۴۲ فی صدی سالانہ منافع بھی دے گی۔ گویا بارہ سال میں یہ روپیہ اگر ایک ہزار ہے تو ڈیڑھ ہزار بن جائے گا۔''

قاضی جی : ''اور بارہ سال تک ہم گویا ڈنڈے بجائیں گے۔ اس عرصہ میں اگر کسی شادی بیاہ میں آپ کو مہمان جانے کی ضرورت ہوگی تو گلے میں، ناک میں، کان میں زیور کی جگہ یہ سرٹیفکیٹ لٹکا کر شرکت کریں گا۔ میں تو حیران ہوں کہ آپ لوگ روز کوئی نہ کوئی اس قسم کا قصہ کھڑا کر دیتی ہیں۔ معلوم نہیں آج کل دماغوں میں کس قسم کے زلزلے آنا شروع ہو گئے ہیں کہ جو سوجھتی ہے ایسی ہی سوجھتی ہے۔''

زبیدہ : ''بھائی جان آپ ذرا سمجھنے کی کوشش کیجیے تو یہ بڑی عمدہ اسکیم ہے۔ بارہ سال کی مدت پر اگر آپ چونک پڑے ہیں تو یہ خیال غلط ہے۔ ان سرٹیفکٹیوں کو ڈیڑھ سال کے بعد منافع کے ساتھ نقد کرایا جا سکتا ہے۔ بلکہ ان میں جو پانچ روپیہ والے سرٹیفکیٹ ہیں وہ تو ایک ہی سال میں بھنائے جا سکتے ہیں۔''

قاضی جی : ''صاحب سب کچھ سہی مگر کم سے کم میرے لیے تو یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ میرے یہاں کے زیور بازار میں بکنے کے لیے جائیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسی قسم کی ایک بات پر میری دوسری شادی کے موقع پر بارات واپس آ گئی تھی۔ ہوا یہ کہ جب بارات پہونچ، چکی لڑکی والوں نے حماقتیں شروع کر دیں۔ ایک اقرار نامے کا مسورہ تیار کیا گیا جس میں بہت سی شرطیں تھیں کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ اس شادی کے بعد دلہن پر کوئی سوت نہ لاؤں گا۔ اس شادی کے بعد دلہن کو ڈھائی سو روپیہ پاندان کا خرچ دیتا رہوں گا۔''

نسیم : 'پاندان کا خرچ کیسا؟''

قاضی جی : ''دلہن کے جیب خرچ کو پاندان کا خرچ کہتے ہیں۔ بہرحال ان ہی شرائط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ جہیز میں جو زیور وغیرہ لے جا رہے

ہیں ان کو بیچ کر ہرگز نہ کھاؤں گا۔ اس شرط پر والد صاحب مرحوم کو بیحد غصہ آیا کہ کیا ہم لوگ ایسے گئے گذرے ہیں کہ بیوی کا زیور بیچ کھائیں گے۔ بڑی تُو تُو میں کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ بارات واپس آگئی بلکہ کچھ مار پیٹ کی بھی نوبت آگئی تھی۔ یہ دیکھو میرے ماتھے پر جو نشان ہے یہ اسی تقریب کی یادگار ہے۔ تین ٹانکے لگے تھے اس میں۔ مگر میں نے جو بھی اپنے نہ ہو سکنے والے خسر صاحب کو وہ پٹخنی دی ہے کہ یاد کرتے ہوں گے۔''

زبیدہ : بھائی جان زیور کو بیچنا اور کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بیچنا دوسری چیز ہے۔ مگر یہاں تو مقصد ہی کچھ اور ہے۔''

نسیم : یہ تو اپنے ملک کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ قوم کی دولت ہی سے قوم طاقتور بنتی ہے۔''

قاضی جی : ''اب میں قوم کا طاقتور بننا دیکھوں یا خاندان کی ناک کا خیال کروں۔ جو سنے گا وہ یہی تو کہے گا کہ قاضی جی اب بیوی کا زیور بیچ بیچ کر کھا رہے ہیں۔ یہ دیکھنے کوئی بھی نہ آئے گا کہ خود بیوی صاحبہ قوم کو طاقتور بنا رہی ہیں۔ زیور بیچ کر ورزش کرا رہی ہیں قوم کو۔ ملک کی بنیادوں کو مضبوط بنایا جا رہا ہے۔ ناممکن ہے۔ ہرگز نہیں کم سے کم میری بیوی یہ نہیں کر سکتیں خواہ وہ یہاں ہوں یا میکے میں۔ مگر ان کو اپنے میکے میں بھی میری بیوی بن کر رہنا پڑے گا۔''

زبیدہ : بات تو سنئے بھائی جان۔''

قاضی جی : ''اس سلسلہ میں کوئی بات میں نہیں سن سکتا۔ خط لکھنے کا کاغذ لاؤ تا کہ

میں ان کو ابھی ایک خط لکھوں کہ یہ قطعی ناممکن ہے۔ رہ گئیں تم۔ تو تم کو اپنا اختیار ہے تم جانو تمہارا کام جانے پرائے گھر کی ہو۔ مگر میری بیوی اوں ہنہ۔ ناممکن۔ قطعی ناممکن۔''

(۲۳)

(قاضی جی دروازے پر دستک دیتے ہیں)

قاضی جی : ''ارے بھئی دروازہ کھولو۔ کھولو دروازہ۔''

زبیدہ : (دور سے) ''آ رہی ہوں بھائی جان۔ آ رہی ہوں (قریب آ کر) آ گئیں بھابی جان۔ ارے تسلیم بھابی جان؟''

بیوی : ''جیتی رہو۔ اچھی تو رہیں۔''

قاضی جی : ''ارے صاحب اندر چل کر یہ بیت بازی کر لیجیے گا۔ یہاں لب سڑک یہ گلے ملنے کا کون سا تک ہے۔ ارے بھئی تم کیا دیکھ رہے ہو تانگے والے، ان پردہ نشین مستورات کو۔ تم سامان اتارو نا۔ کل بائیس عدد ہیں۔ اور اگر گلاس لوٹے میں رکھ دیا ہے تو اکیس عدد ہوں گے۔ طوطے کا پنجرہ احتیاط سے اتارنا۔ کھڑکی کھلی اور وہ اڑا پھر سے۔''

بیوی : ''صراحی نہ ٹوٹ جائے کہیں۔''

قاضی جی : ''اجی نہ صراحی ٹوٹے گی نہ کچھ تم اندر چلو میں سب سامان اتروائے لیتا ہوں۔ اور یہ کیا لے چلیں ہاتھ میں۔ ناشتہ دان تاکہ میں یہاں ٹاپتا پھروں۔ رکھو اس کو یہاں گنتی بھی گڑبڑ ہو کر رہ جائے گی۔ گلاس لوٹے میں ہو تو بائیس ورنہ اکیس عدد۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔''

زبیدہ : ''توبہ ہے ذرا گرد و غبار تو دیکھو۔ کالے رنگ کا برقعہ خاکی ہو کر رہ گیا۔''

بیوی : ''آپ ادھر نکل آئیے نا بھابی جان۔''

زبیدہ : ''مجھے تو امید تھی نہیں کہ بھائی جان گاڑی سے اتار سکیں گے آپ کو۔''

بیوی : ''تو انھوں نے اتارا کب۔ اسٹیشن سے باہر آ کر میری نظر خود پڑ گئی ان پر۔ کھڑے ہوئے دیوار پر لگا ہوا کوئی پوسٹر پڑھ رہے تھے۔''

قاضی جی : (آتے ہوئے) ''سب سامان اتر آیا۔ اچھا بھئی زبیدہ، اب ذرا اپنی عقلمند بھابی جان کے کارنامے سن لو۔ یعنی برقعہ میں آپ لپٹی ہوئی، پھر یہ کہ زنانہ درجہ میں سفر کیا، اور نہ صرف یہ کہ ٹکٹ لے کر آئی ہیں بلکہ ایک ایک چیز وزن کرائی ہے اور خوب جی کھول کر ہر چیز کا محصول دیا ہے۔''

بیوی : ''لو اور سنو۔ تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں بے ٹکٹ سفر کرتی۔ یا اسباب کا محصول نہ دیتی۔''

قاضی جی : ''اب کوئی پوچھے ان عقل کی دشمن سے کہ آج کل کون پوچھتا ہے زنانے درجوں میں عورتوں سے کہ تمہارے پاس ٹکٹ ہے یا نہیں۔ خدا جانے کتنے مسافر بغیر ٹکٹ کے سفر کرتے ہیں۔ خاص طور پر عورتوں کے لیے تو یہ آسانی کتنی بڑی ہے کہ اگر کسی نے فرض کر لیجیے کہ ٹکٹ پوچھ بھی لیا تو پردے کے بہانے سے اس کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ رہیں۔ چلیے چھٹی ہوئی۔ سمجھدار ہو گا تو شرمندہ ہو گا کہ ناحق ایک پردہ نشین بیوی سے ٹکٹ پوچھا۔ اور مان لیجیے کہ بات بڑھ بھی جائے تو تو بھی شرعاً کسی نامحرم کو ٹکٹ

دکھانا جائز نہیں۔''

زبیدہ : ''بھائی جان عورتوں کا ٹکٹ دیکھنے کے لیے لیڈیز ٹکٹ چیکر ہوتی ہیں۔''

قاضی جی : ''جی ہاں مجھے معلوم ہے کہ بعض اسٹیشنوں پر ایک آدھ عورت ٹکٹ کاٹنے کا سروتا لے پھرا کرتی ہے۔ مگر اس کو چکمہ دینا کون سی بڑی بات ہے۔ کہہ دیا جائے اس سے کہ ہمارا ٹکٹ مردانے میں ہے۔ ارے بھئی کوئی وہ بیرنگ تھوڑی کر دے گی بغیر ٹکٹ کے۔ وہ خود جانتی ہے کہ عورتوں کے ٹکٹ مردوں کی جیب میں ہوا کرتے ہیں اور مرد اپنے درجے میں الگ بیٹھتے ہیں۔''

بیوی : ''مگر سوال تو یہ ہے کہ بے ایمانی آخر کی ہی کیوں جائے۔''

قاضی جی : ''لاحول ولا قوۃ۔ اس کو بے ایمانی کون کہتا ہے، یہ تو ہاتھ کی صفائی کہلاتی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے میں نے خود سینکڑوں مرتبہ بغیر ٹکٹ کے سفر کیا ہے۔ بس ذرا یہ احتیاط کرنا پڑتی تھی کہ اسٹیشن آیا اور ہم ٹہل رہے ہیں پلیٹ فارم پر، گویا اس ٹرین سے کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔ دیکھا کہ اپنے ڈبے میں ٹکٹ چیکر جا رہا ہے، ہم پڑوس والے ڈبے میں ذرا چلے گئے۔ ایک آدھ مرتبہ غسل خانہ میں بیٹھ کر دو ایک اسٹیشن گذار دیئے۔ البتہ ایک مرتبہ ذرا چوک گئے تھے۔ چوک کیا گئے تھے یہ کہو کہ ذرا آنکھ لگ گئی تھی کہ ادھر تو کسی نے جیب کاٹ لی اُدھر ٹکٹ بابو آ موجود ہوا۔ اور وہ بھی ایسا آدم بیزار کہ کمبخت نے مجھ کو کسی غیر معروف اسٹیشن پر اتار دیا۔''

بیوی : ''شرم نہ آئی ہوگی کہ اس طرح پکڑے گئے۔''

قاضی جی : ''شرم؟ بھلا شرم کی اس میں کیا بات۔ وہی مثل کہ ع

گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں

وہ لڑکا یعنی وہ شخص کیا گرے گا...... شخص نہیں بلکہ لڑکا...... اونہہ ہوگا کوئی مطلب...... یہ کہ اس کمبخت نے ایک ویران سے کسی جنگل کے اسٹیشن پر اتار دیا۔ رات بھر صاحب وہاں پڑے رہے اور سیاروں کی بولیاں سنتے رہے۔ خدا خدا کر کے صبح ایک بیل گاڑی ملی تو اگلے اسٹیشن تک آ سکے۔''

زبیدہ : ''مگر بھائی جان ایک تو اس قسم کی نیت کی خرابی اس وقت بھی بری بات تھی، دوسرے اب تو بات ہی کچھ اور ہے۔''

قاضی جی : ''ہاں صاحب اب وہ بات کہاں! یہ سب جوانی کے کرشمے تھے۔ نہ اب وہ چستی ہے نہ وہ چالاکی ہے۔ اب تو سچ پوچھو تو سفر کے نام ہی سے دل گھبراتا ہے۔ ورنہ میرا ایسا سیلانی۔ ہر وقت بستر گول رہا کرتا تھا۔ جتنے سفر میں نے کئے ہیں اگر وہ سب ٹکٹ لے کر کرتا تو باپ دادا کی کمائی ریلوے کو دیکر بیٹھ رہتا۔ اور ایک یہ ہیں ہماری بیگم صاحبہ کہ صرف ٹکٹ ہی نہیں لیا ہے بلکہ اسباب تک کا محصول خواہ مخواہ دے کر آئی ہیں۔''

بیوی : ''ایک تو اللہ نہ کرے میں ایسی چوری کروں، دوسرے اب تو اس بے ایمانی کا مطلب یہ ہے کہ جیسے کوئی خود اپنی ہی جیب کاٹ لے۔''

قاضی جی : ''کیا فرمایا، جیب کاٹ لے؟ وہ کس طرح یعنی یہاں جیب کاٹنے کا کیا ذکر تھا۔ بات کہیں گی ضرور خواہ اس بات کا کوئی سر پیر ہو یا نہ ہو۔ ذکر تھا ریل کے سفر کا، بات ہو رہی تھی ٹکٹ لینے یا نہ لینے کی اور

جناب فرما رہی ہیں جیب کاٹنے کے متعلق کچھ۔ پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی۔"

بیوی : "میں یہ کہہ رہی ہوں کہ اب جو یہ قانون شکنی کی جائے گی۔ اس کا نتیجہ کس کو بھگتنا پڑے گا۔ ٹکٹ نہ خریدیں گے تو نقصان کس کو پہونچے گا۔"

قاضی جی : "مجھ کو کیا معلوم کس کو نقصان پہونچے گا۔ میری بلا سے کسی کو پہونچے۔ گویا ایک ٹکٹ جو تم نہ خریدو گی تو اس کا کوئی ایسا عظیم الشان نقصان پہونچے گا کسی کو کہ قیامت آجائے گی۔ یہ تو وہی قصہ ہوا کہ ایک تھا بیل...... یا شاید گائے تھی۔ بات یہ ہے کہ تصویر میں گائے اور بیل کا پتہ ذرا مشکل سے چلتا ہے۔ بہر حال میں نے تصویر دیکھی تھی کہ اس بیل یا گائے کے ایک سینگ پر ایک مکھی بیٹھی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مکھی کو خیال آیا کہ میرے بوجھ سے یہ بیل یا گائے پریشان ہوگئی ہوگی۔ تو خیر...... مگر سنو تو سہی دودھ والے کے حساب کے متعلق جو تم نے لکھا تھا تو میں کیا خاک حساب کرتا...... مجھ کو یہی نہیں معلوم کہ وہ گائے کا دودھ دیتا ہے یا بھینس کا۔"

زبیدہ : "خیر وہ حساب اب بھابی جان خود کرلیں گی۔"

قاضی جی : "کیا کرلیں گی حساب۔ ان کی فیاضیوں کے مارے تو ناک میں دم ہے۔ کوئی پوچھے کہ صاحب ٹکٹ لے لیا تھا تو خیر بھئی چلو لے لیا۔ مگر یہ اسباب تلوانے کی کیا مار پڑ رہی تھی۔"

بیوی : "پھر وہی ٹکٹ اور محصول کا قصہ۔ ایک مرتبہ تو میں کہہ چکی ہوں کہ اب اس قسم کی چوری خود اپنے گھر کو موسنے کے برابر ہے۔"

زبیدہ : "بھائی جان اس طرح پاکستان کو نقصان پہونچانا اب کوئی سچا پاکستانی گوارا نہیں کرسکتا۔"

قاضی جی : "آگیا پاکستان کا ذکر! تم لوگوں کا تو وہ حال ہے کہ جہاں کسی بات کا جواب بن نہ پڑا جھٹ پاکستان کی آڑ لے لی۔ یہ حماقت کیوں کی؟ اس لیے کہ پاکستانی ہیں۔ یہ غلطی کیوں ہوئی؟ پاکستان کی وجہ سے۔ گویا پاکستان کے نام سے آپ لوگوں کی ہر بے وقوفی جائز بن جاتی ہے۔ اب کون پوچھے آپ سے کہ ریل کے ٹکٹ کا بھلا پاکستان سے کیا تعلق۔"

بیوی : "پاکستان سے تعلق یہ ہے کہ ریل پاکستان کی ہے۔"

قاضی جی : "خدا آپ کے بچوں کو سلامت رکھے۔ مگر بچے...... ہونہہ بچے کہاں بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج تم کو میں نے تمہارے ہی گھر میں شکست دی۔ تم کہہ رہی ہو کہ ریل پاکستان کی ہے۔ کہو ہاں۔"

بیوی : "ہاں ہاں کہہ تو رہی ہوں ریل پاکستان کی ہے۔"

قاضی جی : "بس بس بس اب نہ مکرنا اس بات سے کہ ریل پاکستان کی ہے۔ سن لو بی زبیدہ تم بھی۔ اچھا صاحب تو ریل ہے پاکستان کی اور آپ کس کی ہیں؟ پاکستان کی۔ جی۔ پھر کرایہ کا کیا سوال۔ میرا مطلب یہ کہ پھر ٹکٹ کے کیا معنی۔ آپ پاکستان کی، پاکستان آپ کا، ریل پاکستان کی۔ لہٰذا ریل آپ کی۔ پھر اپنی چیز کا کرایہ دینا کیا معنی۔ بولیے۔ ارے بھئی فرمایئے نا۔ اب کیوں چپ ہوگئیں۔"

زبیدہ : "آپ بجلی کا بل کیوں ادا کرتے ہیں؟ پانی کا ٹیکس کیوں دیتے ہیں؟"

قاضی جی : ''وہ تو...... وہ تو...... گویا وہ تو...... مگر تم سے کیا مطلب؟ جواب تو ان کو دینا چاہیے۔ ہاں صاحب فرمایئے آپ۔''

بیوی : ''تم تانگہ والے کو کرایہ کیوں دیتے ہو؟''

قاضی جی : ''چلئے یہی سہی۔ غلطی کرتا ہوں میں آئندہ سے نہیں دوں گا۔''

بیوی : ''راشن جو لاتے ہو اس کی قیمت کیوں دیتے ہو؟ دھوبی کو دھلائی کیوں دیتے ہو؟''

قاضی جی : ''خوب یاد دلایا تم نے اس مردود کو تو اب کی ہرگز دھلائی نہ دی جائے گی۔ تکیوں کے غلاف آج تک لا کر نہیں دیئے اور میری ایک بنیائن کی جگہ خدا جانے کس بیچاری کا جمپر اٹھا لیا ہے۔ اب بتایئے بھلا میں عورتوں کا جمپر پہن سکتا ہوں۔ جو دیکھے وہ بھی کہے کہ یہ قاضی جی ہیں یا کوئی بہروپیہ۔ بہرحال آپ بات نہ ٹالیے۔ میری بات کا جواب دیجیے۔''

بیوی : ''لو اور سنو میں نے بات ٹالی ہے یا خود ہی دھوبی کے ذکر پر دھوبی کی طرف بہک گئے تھے۔''

قاضی جی : ''دھوبی کے ذکر پر دھوبی کی طرف نہیں تو کیا گدھے کی طرف بہکنا چاہیے تھا مجھ کو۔ خیر نہ میں گدھا جانتا ہوں نہ دھوبی۔ مجھ کو تو آپ میری بات کا جواب دیجیے کہ جب پاکستان آپ کا ہے اور ریل پاکستان کی ہے تو ٹکٹ والی غیریت کیسی؟ مجھ کو آپ مثالیں دے کر قایل کرنے کی کوشش ہرگز نہ کیجیے ورنہ مثالوں کی میرے پاس بھی کمی نہیں ہے۔ مثلاً ایک پیش پا افتادہ مثال جوتے کی ہے...... زبیدہ۔ ارے بھئی سنا تم نے پیش پا افتادہ۔ اور جوتا۔ ہائے ہائے کون ان بیساختہ رعائیوں کو سمجھ سکتا ہے۔ اٹھ گئے ان باتوں کو سمجھنے والے۔ آج اگر ابا جان ہوتے تو دس بارہ فقیروں کو کھانا کھلواتے صدقہ کے طور پر۔''

زبیدہ : ''جی ہاں۔ خیر آپ اپنی بات کیجیے جوتے کی مثال سے کیا مطلب۔''

قاضی جی : ''ہاں یہ مثال تو وہ ہے کہ جواب بن نہ پڑے گا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ جوتا میرا ہے۔ تو میں اس کو پہن کر کہیں جانے کا کرایہ تو نہیں دیتا کسی کو جی۔ ارے بھئی جی؟۔ اسی طرح ریل آپ کی ہے تو آپ کرایہ کیوں دیتی ہیں۔''

بیوی : ''یہ جوتا تمہارا جب ہی تو ہوا ہے جب تم نے اس کے دام جوتے والے کو دے دیئے۔ ایک قیمت تو تم کو ادا کرنا پڑی اس کو اپنا بنانے کے لیے۔''

قاضی جی : ''ایں؟ ہاں۔ اچھا خیر چھوڑو جوتے کو۔ مثلاً یہ ٹوپی ہے۔ مگر اس کا بھی تم یہی جواب دو گی۔ وہ تو ایک ہی بات ہوئی۔ خیر چھوڑو اس جھگڑے کو۔ مگر خدا کے لیے مجھ کو یہ سمجھا دو کہ پاکستان کا بس تم ہی کو خیال ہے۔ تم ہی پر ٹیکہ ہے کہ ان باتوں کو سمجھو اور جو یہ بے شمار مسافر بغیر ٹکٹ کے سفر کرتے رہتے ہیں یہ پاکستانی نہیں تو کیا جاپانی ہیں۔''

زبیدہ : ''بھائی جان یہ سب ہمارے دشمن ہیں۔ یہ پاکستان کے دشمن ہیں۔ یہ خود اپنے دشمن ہیں۔''

قاضی جی : ''پھر وہی پاگلوں کی سی بات کی یعنی میں خود ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں کہ ٹکٹ کلکٹر نے ایک بے ٹکٹ مسافر کو پکڑ رکھا تھا اور

اس مسافر کی ٹوپی میں چاند تارہ لگا ہوا تھا۔ ایسا کھلا ہوا پاکستانی اور آپ فرماتی ہیں کہ وہ پاکستان کے دشمن ہیں۔''

بیوی : ''چاند تارہ لگا ہوا یا کچھ لگا ہو۔ لیکن اگر اس نے یہ قانون شکنی کی ہے، حکومت کو یہ نقصان پہونچایا ہے تو وہ بے شک ہمارا دشمن ہے۔ کاش یہ لوگ اب یہ سمجھ سکتے کہ یہ نقصان وہ کسی اور کو نہیں اپنے کو پہنچا رہے ہیں۔

زبیدہ : ''جس تھالی میں کھا رہے ہیں اسی میں چھید کر رہے ہیں۔ جس ڈالی پر بیٹھے ہیں اسی کو کاٹ رہے ہیں۔''

قاضی جی : ''خیر ہماری بلا سے۔ تم تو یہ بتاؤ کہ کیا لائی ہو ہمارے لیے اپنے میکے سے؟ کوئی شیروانی کا کپڑا وغیرہ ملا یا نہیں؟ اور وہ جو میں نے ایک خط میں لکھا تھا کہ ع

چکھا دے چاشنی شربت دیدار تھوڑی سی

اس کا مطلب بھی سمجھی تھیں کہ ایک تو یہ کہ جلدی سے آ جاؤ، دوسرے کچھ اچار وغیرہ ساتھ لیتی آؤ تو اچھا ہے۔''

بیوی : ''اچار بھی لائی ہوں اور سیب کا مربہ بھی۔ مگر وہ ٹوکری کہاں ہے بانس والی۔

قاضی جی : ''بانس والی ٹوکری۔ پچاسوں تو ٹوکریاں ہیں۔ اب مجھے کیا معلوم کہ ان میں بانس والی کون سی ہے۔ دیکھو یہ تو نہیں جو گھڑونچی کے نیچے رکھی ہے۔''

بیوی : ''نہیں اس میں تو پاپڑ ہیں اور بڑیاں وڑیاں ہیں۔ وہ تو بڑی سی ٹوکری تھی۔ کہیں تانگے پر تو نہیں چھوڑ دی۔''

زبیدہ : ''اگر وہ گئی تانگے پر تو بس گئی اب۔''

بیوی : ''اسی میں اچار اور مربہ بھی ہے اور پیٹھے کی مٹھائی بھی۔''

قاضی جی : ''پیٹھے کی مٹھائی؟ ارے بھئی ٹھہرو تو سہی (چیختے ہوئے دوڑتے ہیں) تانگے والے۔ ارے بھئی تانگے والے۔ نکل گیا ہوگا۔ تانگے والے۔ ارے بھئی تانگے والے۔''

(۲۴)

(قاضی جی گھبرائے ہوئے تشریف لاتے ہیں)

قاضی جی : ''لیجیے یہاں پاندان کھلا ہوا ہے۔ گلوریاں بن رہی ہیں۔ چھالیا کاٹی جارہی ہے اور وہاں شہر میں آفت آئی ہوئی ہے۔ خدا کے واسطے جلدی جلدی تمام سامان سمیٹو۔ چھوڑو اس پاندان کو۔ تلے اوپر دو تین جوڑے کپڑے پہن لو۔ روپیہ پیسہ جو کچھ ہے اس کو تعویذ کی شکل میں باندھ لو۔''

بیوی : ''خیریت تو ہے آخر ہوا کیا ہے؟''

قاضی جی : ''ارے بھئی زبیدہ یہ تو کریں گی اس نازک موقع پر بھی وکیلوں والی جرح۔ تم ہی اٹھ کر جلدی جلدی انتظام کرو۔ کچھ آٹا، دالیں اور نمک وغیرہ بھی الگ باندھ لو۔ خدا جانے کس وقت بھگدڑ مچ جائے۔ سب سے پہلے میری بندوق اور کارتوس مجھ کو نکال دو۔ ممکن ہے تم لوگوں کو میں اپنے ہاتھ سے گولی ماروں۔''

زبیدہ : ''بھائی جان خدا کے لیے بتا چکیے آخر ہوا کیا ہے۔ میرا تو دل دھڑکنے لگا۔''

قاضی جی : ''کچھ نہیں دل دھڑکنے کی کوئی بات نہیں۔ بس خدا کو یاد کرو۔ میرے حقہ کی تمبا کو کہیں نہ بھول جانا گھبراہٹ میں۔ زیوروں کے لیے یہ کرد

کہ کسی ایسی چیز میں رکھ دو جو نہایت حقیر سی ہو، تاکہ کسی کا خیال نہ جائے اس چیز کی طرف۔ کچھ زیور تو لاؤ میں حقہ کا پانی پھینک کر اس میں رکھ دوں۔ بس خدا کو یاد کرو۔ وہ آئی بلا کو ٹال سکتا ہے اور یاد رکھو کہ عزت کی موت بے عزتی کی زندگی سے ہر حال میں اچھی ہے۔ جب میں نشانہ باندھوں تو بندوق کے سامنے سے ہٹ نہ جانا۔''

بیوی : ''میں کہتی ہوں آخر یہ کیا بکتے چلے جا رہے ہو۔ زبیدہ بہن ذرا پڑوس سے جمیل بھائی کو یا اکرم کو جو کوئی بھی ہو آواز دے لو۔ خدا کے واسطے اب بتا دو آخر ہوا کیا ہے۔''

قاضی جی : ''حملہ۔ حملہ ہوا ہے۔ ٹڈی دل فوج نے حملہ کیا ہے۔ مگر گھبراؤ نہیں۔ موت برحق ہے اور اللہ مالک ہے۔ تم جلدی جلدی دس بیس پان کے ٹکڑے بنالو۔ پھر جانے کب ملیں یاں۔ اس کے علاوہ کوئی اور چلم بھی ہے۔''

بیوی : ''آگ لگے تمہاری چلم کو۔''

قاضی جی : ''اے صاحب یہ وقت شاعری کا نہیں ہے کہ آپ چلم اور آگ کی رعائتیں ڈھونڈھتی پھرتی ہیں۔ اپنی تمام ضروری چیزیں سمیٹ کر ایک جگہ رکھ لو۔ یہ پاندان خاصدان سب چھوڑو اپنی جان بوجھل ہوتی ہے اس قسم کے موقعوں پر۔ میں تو اپنے دو تین جوڑے اوپر نیچے پہنے لیتا ہوں۔ نوٹ جو کل میں نے دئے تھے وہ مجھ کو دے دو۔ بوٹ کے اندر رکھ کر ڈوری باندھے لیتا ہوں۔ خدا کے لیے یہ چپل اتارو دو کھسر کھسر کرتی ہوئی کہاں تک بھاگو گی۔''

جمیل : ''(آتے ہوئے) خیریت تو ہے قاضی جی۔''

شکیلہ : ''قصہ کیا ہے آخر بہن۔ میں تو توے پر روٹی چھوڑ کر بھاگ آئی۔''

قاضی جی : ''کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ بس خدا کو یاد کرو۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ جمیل میاں اپنا دروازہ بند کر کے اس طرف آ جاؤ تم لوگ بھی۔ بندوق بھر کر ساتھ رکھو۔ اور میں نے کہا سنتی ہو ایک آدھ خلال مجھ کو دے دو جیب میں ڈال لوں۔''

جمیل : ''مگر قبلہ بات تو معلوم ہو کچھ۔''

قاضی جی : ''میں کہہ دیا کہ وقت نازک ہے۔ فضول باتوں میں اس وقت کو برباد نہ کرو۔ جو کچھ گہنا پاتا ہو اس کو باندھ بوندھ کر سنبھال لو۔ نہایت ہی ضروری چیزیں ساتھ میں لینا، باقی سب اللہ کو سونپ دو۔ حملہ ہو چکا ہے۔ شہر میں بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔''

جمیل : ''حملہ؟ حملہ کون کر سکتا ہے بھلا۔''

قاضی جی : ''اب میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ حملہ کون کرتا ہے۔ حضرت حملہ دشمن کرتا ہے اور جب وہ حملہ کرتا ہے تو اس کو حملہ آور کہتے ہیں۔ اب یہ باتیں سمجھئے گا اس وقت بیٹھ کر یا کچھ انتظام بھی کیجیے گا۔''

بیوی : ''مگر تم کو معلوم کیسے ہوا آخر کہ خدانخواستہ حملہ ہوا ہے؟''

جمیل : ''کیا آپ نے خود دیکھا ہے؟''

قاضی جی : ''اے جناب ابھی میں باہر گیا تھا ذرا گنڈیری لینے کہ اتنے میں چھٹن خاں کو دیکھا کہ جوتیاں ہاتھ میں لیے سرپٹ بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے دوڑ کر ان کو پکڑا تو غریب کے پیٹ میں سانس نہ سماتی تھی بمشکل تمام بتایا کہ حملہ ہو گیا ہے بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔''

بیوی : ''آگ لگے چھٹن خاں کی صورت کو۔ وہ موا ایک ہی لپاٹیا زمانے بھر

کا۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی شگوفہ چھوڑا کرتا ہے۔''

قاضی جی : ''خدا کے واسطے میرے حال زار پر رحم کرو۔ یہ وقت چھٹن خاں سے دشمنی نکالنے کا نہیں ہے، فرض کرو کہ وہ جھوٹ بولا کرتا ہے۔ تو بھی اس طرح بے تحاشا سر پر پیر رکھ کر جو وہ بھاگا جا رہا تھا تو گویا یہ بھی جھوٹ تھا۔ یقیناً اس نے حالات خطرناک دیکھے ہوں گے۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ بات تک تو منہ سے نکلتی نہ تھی۔''

جمیل : ''یہ تو درست ہے قاضی جی مگر ذرا غور کیجیے۔''

شکیلہ : ''غور کیا کریں یہ سچ تو کہہ رہے ہیں کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہوگی۔ بھئی اللہ میرے تو ہاتھ پیر کانپنے لگے۔''

قاضی جی : ''کانپنے کی بات ہی ہے۔ خدا بُرے وقت سے بچائے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ فرض کر لو کہ جھوٹ ہی ہے یہ بات اور خدا کرے جھوٹ ہی ہو۔ پھر بھی آخر بھاگ نکلنے میں کیا نقصان ہے۔ اگر یہ بات سچی ہے تو یہ بھاگ نکلنا کام آ جائے گا اور اگر جھوٹ ہے تو پھر واپس آ سکتے ہیں اپنے گھر۔ مگر یہاں تو چھڑ گئی ہے بحث۔''

جمیل : ''اچھا صاحب میں جا کے ذرا تحقیقات کرتا ہوں۔''

شکیلہ : ''کوئی ضرورت نہیں جانے کی۔ جائیں گے تو سب ساتھ جائیں گے۔''

جمیل : ''پاگل ہیں آپ۔ میں اس کا قائل نہیں کہ سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے بھاگنا شروع کر دوں۔ (جاتا ہے)

زبیدہ : ''لیجیے وہ تو نکل بھی گئے۔ اس وقت اس طرح خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے تھا۔''

شکیلہ : ''بات کی ساعت تو کرتے ہی نہیں۔ اللہ اصل خیر واپس لائے تو میں مولا مشکل کشا کی نیاز دلاؤں گی۔''

قاضی جی : ''گھبراؤ نہیں۔ اس پر نظر رکھو وہی فضل کرنے والا ہے۔ مگر خدا کے لیے اس بحث میں پڑنے کے بجائے تم لوگ کمر باندھے تیار رہو۔ جو آثار نظر آرہے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے تو ہونے والا یہ ہے کہ ایک دم سے کھلبلی مچ جائے گی۔''

بیوی : ''مجھے تو چھٹن خان لنگوز مارے کا نام سنتے ہی اطمینان ہوگیا ہے کہ نہ کوئی حملہ ہوا ہے نہ کچھ۔ یہ سب اس کا......''

قاضی جی : ''تم کو قسم ہے کہ یونہی کھڑی ہوئی ٹر ٹر کیے جانا۔ اے بھئی زبیدہ خدا کے لیے تم ہی باندھ بوندھ شروع کردو۔ ایک دم سے اگر بھاگنا پڑ گیا تو کچھ لے بھی نہ سکیں گے۔ بھلا بتائیے یہ وقت چھٹن خاں کی شان میں قصیدہ پڑھنے کا ہے یا اپنی جان بچانے کا۔ چھٹن غریب کا قصور صرف اتنا ہے کہ اس نے وقت پر خطرے کی اطلاع کردی۔ بجائے اس کے کہ اس کا شکریہ ادا کیا جائے اس کو برا بھلا کہا جارہا ہے۔''

بیوی : ''برا اس لیے کہا جارہا ہے کہ وہ موا نشے میں ہمیشہ اس طرح بے پر کی اڑایا کرتا ہے۔ زلزلے کی خبر بھی تو وہی لایا تھا لنگوز مارا۔''

قاضی جی : ''اچھا بھئی تم کو اختیار ہے تم جھوٹ ہی سمجھو مگر مجھ کو اپنی جان پیاری ہے۔ تم میرا سامان ٹھیک کردو میں تو اپنی جان لے کر بھاگ جاؤں پھر تم جانو تمہارا کام۔ جب حملہ آور آپہونچیں سر پر تو ان سے کہہ دینا کہ میں تو سمجھی تھی چھٹن خاں موا جھوٹ بول رہا ہے تم لوگ تو سچ مچ آپہونچے۔''

شکیلہ : ''ہائے اللہ مجھے تو ان کی فکر پڑ گئی کہ یوں ہی خالی ہاتھ نکل کھڑے ہوئے۔''

زبیدہ : ''مگر بھائی جان یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ سڑکیں اسی طرح چل رہی ہیں۔ دوکانیں کھلی ہوئی ہیں لوگ چل پھر رہے ہیں۔''

قاضی جی : ''مطلب یہ کہ اگر تمام دنیا حماقت میں مبتلا ہے تو ہم بھی عقل سے کام نہ لیں۔ خدا کے واسطے تم لوگ وقت کی قدر کرو۔ یہ جو بھاگنے کا تھوڑا سا وقت مل گیا ہے، اس کو غنیمت سمجھو اور آپس میں ایک دوسرے سے مل ملا لو۔ پھر خدا جانے کیا قسمت میں ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ نیا جوتا پہنتا ہوں تو وہ بھاگنے میں پھسلے گا الگ اور کاٹے گا الگ۔ پرانا جوتا پہنتا ہوں تو یہ تھوڑی دور جا کر دانت نکال دے گا۔''

زبیدہ : ''لیجیے جمیل بھائی تو آگئے۔''

قاضی جی : ''کہاں تک پہونچے حملہ آور۔ ارے بھئی بھاگ نکلنے کا موقع بھی ہے یا نہیں۔''

جمیل : (قہقہہ لگاتے ہوئے) ''لاحول ولاقوۃ۔ صاحب کمال کا آدمی ہے یہ چھٹن خاں بھی۔ اور آپ بھی اس کی بات پر ایسا یقین کرلیتے ہیں۔''

بیوی : ''دیکھ لیا۔ میں پہلے ہی جانتی تھی کہ چھٹن خاں ہمیشہ اس طرح بے پر کی اڑایا کرتا ہے موا دنیا بھر کا لپاٹیا۔''

قاضی جی : ''ارے صاحب بات تو سننے دو۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ گویا حملہ ملتوی کردیا گیا۔ یعنی کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوگا۔ چھٹن خاں اب اتنے بڑے مصنف تو ہیں نہیں کہ پورا قصہ گھڑ لیں اپنے دل سے۔''

جمیل : ''صاحب جب میں ہر طرف تحقیقات کر کے بے وقوف بن چکا تو

میں نے چھٹن خاں کو جا کر گھیرا کہ یہ تم نے حملے کی خبر کہاں سے اڑائی تھی۔ ان حضرت کے حواس بجا نہ تھے۔ گھر میں چھپے بیٹھے تھے۔ کہنے لگے کہ میں نے آغا صاحب کو بھاگتے دیکھا ہے بے تحاشہ اور جب ان سے پوچھا تو وہ بھاگتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ حملہ ہوا ہے، نہایت سخت حملہ۔''

قاضی جی : ''تب تو یقیناً ہوا ہے حملہ۔ آغا صاحب اس قسم کی لغویات بغیر کسی واقعہ کے ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ وہ نہایت سلجھے ہوئے آدمی ہیں۔''

جمیل : ''آغا صاحب بھی کون سے دور تھے۔ میں نے ان سے جو پوچھا تو اطمینان سے کہنے لگے کہ اب تو الحمد للہ افاقہ ہے۔ قولنج کے درد کا حملہ ہوتا ہے گھر والی پر۔ آج یہ حملہ نہایت ہی سخت تھا۔'' (ہنستا ہے)

بیوی : ''خدا سمجھے اس کل منہے موئے چھٹن خاں سے، دم ہی نکال لیا سب کا۔''

شکیلہ : ''توبہ ہے۔ بات کیا تھی کیا بن گئی۔''

قاضی جی : ''مگر سوال تو یہ ہے کہ اس تمام واقعہ میں بیچارے چھٹن خاں کا کیا قصور ہے، جو اس پر صلواتیں پڑ رہی ہیں۔ یہ حماقت تو آغا صاحب کی تھی کہ اس طرح غریب چھٹن خاں کو بوکھلا دیا۔''

زبیدہ : ''بھائی جان افواہیں یوں ہی تو پھیلا کرتی ہیں۔''

بیوی : ''وہ تو کہیے کہ اس وقت جمیل میاں موجود تھے ورنہ ہم لوگ بھاگ کھڑے ہوتے۔ ہماری دیکھا دیکھی اور خدا جانے کتنے یہی حرکت کر گزرتے۔''

جمیل : ''فسادات کے زمانہ میں جتنا نقصان ان افواہوں کی بدولت پہونچا ہے اتنا کسی اور بات سے نہیں پہونچا۔''

زبیدہ : ''ان افواہ پھیلانے والوں سے بڑھ کر ہمارا دشمن اور کوئی نہیں ہو سکتا۔''

قاضی جی : ''خیر آپ لوگوں کو تو ہر ایک اپنا دشمن ہی نظر آتا ہے، مگر میں ان افواہوں کو اپنے نزدیک بیحد مفید سمجھتا ہوں۔''

بیوی : ''اے تم اپنی نہ کہو، جو بات ہے موئی اُلٹی۔''

قاضی جی : ''صاحب بات سنا کیجیے۔ ہر وقت مجھ کو گھر کی مرغی نہ سمجھا کیجیے۔ میں نے جو نکتہ اس وقت پیدا کیا ہے کاش اس کو آپ سمجھ سکتیں۔ افواہوں کا ایک مفید پہلو میرے نزدیک یہ ہے کہ ان خبروں کو سن کر انسان ذرا چوکنا ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک قسم کی مستعدی آ جاتی ہے۔ یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ بے خبری سے افواہ بہر حال بہتر چیز ہے۔ کیوں بھئی جمیل غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں۔''

جمیل : ''میری سمجھ میں تو یہ حکیمانہ نکتہ آیا نہیں۔''

بیوی : ''اور نہ خدا کرے کسی کی سمجھ میں آئے۔''

قاضی جی : ''اے جناب میں خود نہیں چاہتا کہ میری بات آپ لوگوں کی سمجھ میں آئے لعنت ہے میری اس بات پر، جس کی قسمت میں یہ لکھا ہو کہ وہ آپ لوگ بھی سمجھ سکیں۔ میں تو اس دن خودکشی کر لوں گا جس دن میری باتیں آپ لوگوں کی سمجھ میں آنے لگیں گی۔ میری باتیں سمجھنے کے لیے کھوپڑی میں گھاس پھوس کی نہیں دماغ کی ضرورت ہے۔''

بیوی : اللہ اس دماغ سے سب کو محفوظ رکھے۔''

قاضی جی : ''خیر۔ خیر۔ مجھ کو تو اس وقت یہ مضمون خوب سوجھ گیا ہے۔ افواہوں

کے مفید پہلو پر خاصہ مضمون تیار ہو سکتا ہے۔ عنوان ہوگا ہمارے محسن افواہ پھیلانے والے۔ زبیدہ ذرا دوات میں پانی ڈال دو۔ میں جب تک کاغذ لے آؤں اس وقت دماغ موزوں ہے ذرا۔

محمد شریف عباسی خوشنویس، لاہور (ستمبر ۱۹۴۸ء)

ختم شد